رجسٹرڈ نمبر ایل 7360

جلد ۴ | مارچ ۱۹۶۱ء | عدد ۳

ماہنامہ میثاق لاہور

★

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

○

دفتر رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور (پاکستان)

قیمت فی پرچہ : ساٹھ پیسے

سالانہ : چھ روپے (بارہ شلنگ)

Monthly MEESAAQ Lahore

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۴ | بابت ماہ مارچ ۱۹۶۱ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۸۰ھ | عدد ۳

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورۂ بقرہ ——— " ——— ۹

مطالعہ حدیث

سنت نبوی اور خلفاء راشدین ——— مولانا عبدالغفار حسن صاحب ——— ۲۱

اجتماعیات و سیاسیات

اسلام کا شورائی نظام ——— مولانا سید جلال الدین صاحب انصر عمری ——— ۳۴

اقتباسات و تراجم

تبلیغ مسیحیت کے ہتھکنڈے ——— خالد مسعود صاحب، ایم۔ایس۔سی ۴۸

تقریظ و تنقید

• سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم • نصیحۃ المسلمین • مروجہ بدعات • فتنۂ قادیانیت ۵۵
• استعانت بالاولیاء • حیات جاوداں • ماہنامہ افکار نو (خ۔م)

ہندوستانی خریداروں کے لیے ترسیل زر کا پتہ
دفتر "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تذکرہ و تبصرہ

قارئین میثاق کو یاد ہوگا، کچھ عرصہ پہلے ان صفحات میں ہم نے اخوان المسلمون کے لیڈر جناب ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کا ایک مراسلہ شائع کیا تھا جس میں موصوف نے جنیوا میں ایک اسلامی مرکز کے قیام کی دعوت دی تھی۔ اس ماہ جنیوا سے ہمیں اس مرکز کے قیام کی خوشخبری اور ساتھ ہی مرکز کے اغراض و مقاصد اور اس کے قواعد و ضوابط کی کاپی موصول ہوئی ہے۔ اس مرکز کے قیام سے ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوئی ہے اس وجہ سے ہم دلی خوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جن لوگوں نے یہ مبارک قدم اٹھایا ہے ان کو پوری ملت اسلامیہ کے شکریہ کا مستحق خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ہمت وروں کو جزائے خیر دے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز ہمارے اندر اضافہ ہو۔

اس مرکز کے جو اغراض و مقاصد بیان کئے گئے ہیں ان میں دو باتیں بنیادی اہمیت رکھنے والی ہیں ایک یہ کہ اس مرکز کا قیام صرف اللہ تعالیٰ کی راہ میں کام کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے اس وجہ سے یہ ہر قسم کے نسلی اور علاقائی تعصبات سے بالاتر رہے گا اور کسی متنازعہ فیہ مسئلہ میں حصہ نہ لے گا۔ دوسری یہ کہ یہ مرکز اس زمانہ میں ملحدانہ مادہ پرستی کے ہر چیلنج کو قبول کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتے ہوئے یہ

یقین رکھتا ہے کہ خدا پر ایمان اور اس کے حضور اپنی ذمہ داری کا یقین رکھنے والوں کے لیے ابھی وقت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں اور متحد ہو کر اس چیلنج کو اس اعتماد کے ساتھ قبول کریں کہ اس طرح وہ اپنے اپنے مذاہب کی مدافعت کر رہے ہیں۔ اس اعتماد کے بعد مختلف مذاہب کے لوگوں کا اس مرکز کے نزدیک یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مناظرہ بازی کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے اور اختلافات پر جھگڑتے رہنے کے بجائے مشترک نکات پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش کریں۔ یہ مرکز انہی خطوط پر ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر رہتے ہوئے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں کام کرے گا۔

فی الحال یہ مرکز مذکورہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو کام اپنے پیش نظر رکھتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ جنیوا میں بسنے والے اور وہاں آمد و رفت رکھنے والے مسلمانوں کے لیے ایک مسجد، ایک اسلامی لائبریری اور ایک لیکچر ہال کا قیام۔

۲۔ ذہنوں سے بلاوجہ کا تعصب دور کرنے، نیز اسلام اور مسلمانوں سے بہتر واقفیت پیدا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً تقریروں اور مذاکرات کا اہتمام۔

۳۔ مفید لٹریچر (کتب، رسائل، جرائد اور پمفلٹ وغیرہ) کی تیاری اور ان کی طباعت و اشاعت۔

۴۔ اسلامی مباحث پر مفید لٹریچر کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ۔

۵۔ کتابوں، رسالوں اور اخبارات میں چھپنے والے ایسے مضامین کا تعاقب جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے والے ہوں۔ نیز کتابوں، مقالات یا ایڈیٹر کے نام خطوط کی شکل میں اصل حقیقت کی وضاحت۔

۶۔ مسلمان طلبا اور مہاجرین کی مذہبی، ثقافتی اور سماجی ضروریات پورا کرنا (سوئٹزرلینڈ میں بالخصوص اور دوسرے ممالک میں بالعموم)

۷۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق موضوعات پر ریسرچ کرنے والے اشخاص کو ضروری سہولتیں اور امداد بہم پہنچانا۔

۸۔ جنیوا اور یورپ کے دوسرے مقامات پر مسلمان بچوں کو اپنی ثقافت سے بہرہ ور کرنے کے لیے کنڈر گارڈن اور دوسرے طرز کے سکولوں کا قیام۔

۹۔ جنیوا کے باہر ایسے مقامات پر جن کو مرکز کا انتظامی بورڈ مناسب خیال کرے مساجد اور سنٹروں کی شاخوں کا قیام۔

۱۰۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صحیح علم و واقفیت پھیلانے کے لیے دوروں کا انتظام۔

ان دس کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس مرکز کی کوشش سے اگر وہی پورا ہو جائے تو ہم اس کو بڑی کامیابی سمجھیں گے لیکن اگر یہ مرکز فی الواقع وہ سارے کام انجام دے سکا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو ہمارے نزدیک اس زمانہ میں یہ اسلام اور مسلمانوں کی اتنی بڑی خدمت ہو گی کہ اس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکیں گے۔ آج ہمارے کام کرنے والوں کو ہنگامی قسم کے کاموں سے تو دلچسپی ہوتی ہے لیکن اس قسم کے ٹھوس تعمیری کاموں سے بہت کم لوگوں کو دلچسپی ہوتی ہے جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ایک ایسی راہ کھولی جس پر استقلال کے ساتھ اگر وہ کام کر سکے تو انشاء اللہ وہ اپنی قوم کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک نہایت مبارک نقش قدم چھوڑیں گے۔

مذکورہ بالا مقاصد میں سے یوں تو ہر مقصد جیسا کہ ہم نے عرض کیا نہایت اہمیت رکھتا ہے لیکن خاص طور پر ان طلبہ ہی کے مسئلہ کو لے لیجیے جو مختلف اسلامی ممالک سے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جاتے ہیں۔ یہی طلبہ ہیں جو حصول تعلیم کے بعد جب اپنے اپنے ملکوں کو واپس آتے ہیں تو ذمہ داری کے عہدوں اور قیادت کے مناصب پر سرفراز ہوتے ہیں درآنحالیکہ یورپ کے زمانۂ قیام میں نہ صرف یہ کہ ان کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا بلکہ ان میں سے بیشتر مخالفِ اسلام نظریات کے نہایت پرجوش علم بردار بن کر لوٹتے ہیں۔ اگر یہ مرکز کوئی ایسی شکل پیدا کر سکا جس سے ان طلبہ کے ساتھ اس کا رابطہ قائم ہو سکا اور یہ ان کی

مذہبی اور ثقافتی ضروریات پوری کر سکا تو یہ پورے عالم اسلامی پر اس کا ایک ایسا احسان ہو گا جس سے ہم کبھی سبکدوش نہ ہو سکیں گے۔

اس مرکز کی کامیابی کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کو چند ایسے اصحاب فکر کا پورا پورا تعاون حاصل ہو جائے جو مسلمانوں میں علمی، مذہبی اور فکری اعتبار سے اونچا مقام رکھتے ہیں اور جو اس پر تیار ہوں کہ اپنی تمام مقامی پابندیوں سے آزاد ہو کر اس کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں گے۔ اس قحط الرجال میں موزوں اشخاص کا فراہم ہونا بڑا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ آج بھی عالم اسلامی میں ایسے اشخاص نایاب نہیں ہیں جو اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں جو اس مرکز کے پیش نظر ہے، البتہ مسئلہ ان کے جمع کر لینے کا ہے۔ اگر سعید رمضان صاحب ان کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے (ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس میں کامیاب کرے) تو اس راہ کی جو اصل مشکل ہے وہ دور ہو جائے گی۔ بین الاقوامی درجہ و مرتبہ کے کچھ اشخاص اس مرکز کے ساتھ اگر وابستہ ہو گئے تو ان کی کشش تمام عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اس کی طرف متوجہ کر دے گی۔ ہمیں امید ہے کہ جن لوگوں پر اس قسم کے کاموں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور جو اس کے اہل ہیں وہ از خود اس کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور اپنے امکان کے حد تک اس کو کامیاب کرنے کی کوشش کریں گے۔

دوسری چیز ضرورت کے مطابق اس کے لیے سرمایہ کی فراہمی ہے۔ اوّل تو اس کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہو گی۔ ثانیاً یورپ اور خاص کر جنیوا میں ہونے کی وجہ سے اس کے تقاضے دوسرے اداروں کی نسبت بالکل مختلف ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مرکز کے لیے سرمایہ فراہم ہونے میں زیادہ زحمت پیش نہیں آئے گی۔ مسلمانوں کے اندر ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو سرمایہ بھی رکھتے ہیں اور جن کو ان کاموں کی اہمیت اپیل بھی کرے گی جو اس مرکز کے پیش نظر ہیں۔ اس طرح کے ارباب خیر سے امید ہے دلی جوش کے ساتھ اس کام میں تعاون کریں گے۔ جو حضرات اس مرکز سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ ذیل کے پتہ پر مراسلت کر سکتے ہیں :—

ISLAMIC CENTRE
P.O. BOX 333, CORNAVIN GENEVA, SWITZERLAND

بقیہ تقریظ و تنقید

ان کا تمام تر استدلال قرآن مجید سے ہے۔ یہ رسالہ عوام الناس کے لیے مفید ہے۔ چونکہ یہ ڈیڑھ صدی پیشتر لکھا گیا تھا، اس لیے زبان پرانی ہے اور اس کا اندازہ اوپر کے اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔
یہ رسالہ ۷۶ صفحات کا ہے اور اشاعت فنڈ کے پچیس پیسے ادا کر کے ناشرین سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
(خ۔م)

• مروّجہ بدعات • فتنۂ قادیانیت • استعانت بالاولیاءً

مصنف : صفوۃ الرحمٰن صابر

شائع کردہ : ادارہ اہل سنت و جماعت کمان سلطان شاہی حیدر آباد دکن

علی الترتیب ۴۴، ۴۸ اور ۳۲ صفحات کے یہ پمفلٹ ایک ایسے ادارہ نے شائع کیے ہیں جس کا مطمح نظر مسلمانوں کے اندر عقیدہ و عمل کی گمراہیوں کو دور کرنا اور انھیں ایک ملت کی حیثیت سے متحد کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ پمفلٹ اگرچہ مختصر ہیں لیکن اہم موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ "مروجہ بدعات" میں فاضل مصنف نے قرآن و سنت سے بدعت کا مفہوم اور اس کے بارے میں دینی تعلیمات واضح کی ہیں اور مسلمانوں کے معاشرہ میں جو بدعات پائی جاتی ہیں ان کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے۔ اس کے علاوہ تجدد پسند طبقہ کی کسی اسلامی اکیڈمی پر فاضل مصنف کی تنقید بھی اسی پمفلٹ میں شامل ہے۔

'فتنۂ قادیانیت' میں قادیانیت کے فریب کو بے نقاب کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ خود مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی وہ تحریریں جمع کر دی گئی ہیں جو آپ ہی آپ ان کی گمراہیوں پر دلیل ہیں۔

'استعانت بالاولیاء' میں قرآن مجید سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ استعانت صرف خدائے تعالیٰ سے جائز ہے، کسی نبی یا ولی سے نہیں۔

تینوں کتابچوں میں فاضل مصنف نے اپنا نقطۂ نظر اچھے لہجہ اور اسلوب سے پیش کیا ہے اور اپنی

بات کے لیے دلائل جمع کر دیئے ہیں۔ ان کی تنقید میں تعمیر کا پہلو روشن ہے۔ مجموعی طور پر یہ تینوں پمفلٹ مفید ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ صرف محصول ڈاک کا خرچ ادا کر کے محمد عبد اللطیف رکن ادارہ اہل سنت و جماعت خداداد کالونی ۵.۱۵۱ کراچی نمبر ۵ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ (خ۔م)

• حیاتِ جاوداں

تصنیف : ڈاکٹر میر محمد حسن ایم۔ اے پی ایچ ڈی

صفحات : ۲۶۸ (بڑی تقطیع) قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ : سعیدیہ کتب خانہ اردو بازار راولپنڈی

حیاتِ انبیاءؑ کے مسئلہ پر ہمارے ملک کے علماء کے دو طبقوں میں جو بحث کچھ عرصہ سے چل رہی ہے، زیرِ نظر کتاب اسی بحث کے سلسلہ میں تحریر ہوئی ہے۔ فاضل مولف نے حیاتِ انبیاء کے اثبات میں ان تمام آراء کو جمع کرنے کی سعی کی ہے جو مفسرین و محدثین سے منقول ہیں۔ کتاب کی ترتیب میں پچھلے علماء کی تصنیفات اور خصوصاً امام ابن قیم کی کتاب الروح سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آخر میں حیات انبیاء کے حق میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی، حافظ بیہقی اور امام سیوطی کی مصنفات اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کر دی گئی ہیں۔ اس جمع و تدوین کے نتیجہ میں مصنف اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ایک نہایت ہی جامع کتاب پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک اختلافی مسائل کو ہوا دینا اور ان کی تائید و تردید میں مناظرے و مجادلے منعقد کرنا، یا ضخیم کتابیں تصنیف کرنا دونوں ہی کچھ غیر مفید سے کام ہیں۔ ان سے دین کا وقار تو کیا بلند ہوگا البتہ اس قسم کے معرکوں سے ملک کا نوجوان طبقہ دین کے علمبرداروں سے کچھ بدظن ضرور ہو جاتا ہے۔

تاہم یہ کتاب اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں کامیاب ہے اور ان لوگوں کے مطالعہ کے لیے کافی مواد اپنے اندر رکھتی ہے جو اس قسم کے مباحث سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ کاغذ، کتابت و طباعت ہر چیز اچھی ہے۔
(خ۔م)

• ماہنامہ افکارِ نو

صفحات ۶۴ - قیمت فی پرچہ پچاس پیسے ، سالانہ چندہ چھ روپے

دفتر اشاعت : ۲ - بیگم روڈ لاہور

یہ ماہنامہ چند ماہ سے تقویم کوثر، بنت مجتبیٰ مینا، پروفیسر صوفی عبدالعزیز اور پروفیسر محمد ارشد خاں بھٹی کی اجتماعی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ کی سعی یہ ہے کہ یہ پرچہ بیک وقت ایک علمی، ادبی اخلاقی اور تعمیری جریدہ کا مقام حاصل کرے اور معاشرہ کے ہر فرد کے لیے یکساں دلچسپی کا مرکز بنے، چونکہ بیک وقت ان تمام صفات سے متصف ایک معیاری پرچے کی ہم واقعی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس لیے 'افکارِ نو' کے ادارہ کی اس کوشش کو قابلِ ستائش سمجھتے اور اس کی بار آوری کے لیے دعا کرتے ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر جنوری ۱۹۶۱ء کا شمارہ ہے۔ اس میں 'تعمیرِ انسانیت' 'صحت و زندگی' 'وجود زن' 'ادب نواز' اور 'مستقبل کے معمار' مستقل عنوانات ہیں۔ ان کے علاوہ چار مقالات، دو افسانے اور تیرہ غزلیں شاملِ اشاعت ہیں۔ مضامین میں اگرچہ مقصدیت بھی ہے اور معلومات بھی، لیکن عام طور پر ان کا معیار کچھ اونچا نہیں۔ پرچہ میں نہ صرف کتابت کی غلطیاں باقی ہیں بلکہ زبان کی تصحیح کا اہتمام بھی شاید نہیں کیا گیا۔ منظومات کا حصہ ضرورت سے کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ افکارِ نو کے فاضل مدیروں کو پرچہ کے معیارِ مطلوب تک لانے کے لیے ابھی کئی منزلیں طے کرنی ہوں گی اور اس کے لیے خاص محنت کرنی پڑے گی۔ (خ-م)

تدبّرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۲۰)

قَالُوا ادْعُ لَنَا ..... فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ | گائے کی قربانی کے حکم کے بعد یہ سوال جو بنی اسرائیل نے کیا یہ محض ان کے فساد مزاج کا پیدا کردہ تھا، فی الواقع یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے مزاج میں سلامت روی ہوتی تو وہ متوسط درجہ کی کوئی سی گائے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اس ذہنیت سے واقف تھا جو اس سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی اس وجہ سے سوال کا وہ جواب تو اس نے دے دیا جو ان کے اشتباہ کے دور کرنے کے لیے کافی تھا، یعنی یہ کہ گائے اپنی عمر کے لحاظ سے اوسط درجہ کی ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی بے چون و چرا تعمیل کرو، اس قسم کے سوال کر کے نہ شریعت سے گریز کی راہیں تلاش کرو اور نہ اپنے لیے دین کی وسعتوں کو تنگ کرو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا ..... بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ | گائے کے رنگوں میں سنہرا اور زرد رنگ سب سے زیادہ دل پسند رنگ ہے۔ عرب شعراء اسی پسندیدگی کے سبب سے محبوبہ کے لیے بھی یہ صفت لاتے ہیں۔ فاقع کا لفظ اسی رنگ کی گہرائی اور شوخی کے لیے آتا ہے۔

اوپر کا سوال بھی اگرچہ غیر ضروری تھا لیکن عمر کی ایک حد معین ہو جانے کے بعد تو گائے سے متعلق کسی سوال کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے رنگ سے متعلق سوال کر دیا۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس رنگ کی گائے متعین فرمائی جس رنگ کی گائے سب سے زیادہ خوشرنگ اور

پسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سوال کے جواب میں سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ ہی کی ہدایت ہونی تھی لیکن اسی طرح کے سوالات ہیں جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو شریعت الٰہی کی وسعتوں اور رخصتوں سے محروم کرکے اس کو اصر و اغلال کا ایک مجموعہ بنا لیا۔

انها بقرة .... مسلمة لاشية فيها قالوا الآن جئت بالحق ‎ رنگ کی وضاحت کے بعد بھی سوال کرنے والوں کی تشفی نہ ہوئی۔ انھوں نے مزید وضاحت چاہی تو ہدایت ہوئی کہ گائے کمیری نہ ہو، اس سے کھیتوں میں ہل چلانے اور پانی دینے کی خدمت نہ لی گئی ہو۔ مزید یہ ہدایت ہوئی کہ بالکل یک رنگ ہو۔ اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔

اس طرح اپنے لیے گوناگوں قیدیں اور پابندیاں بڑھا چکنے کے بعد بولے کہ ہاں اب بات اچھی طرح واضح ہوئی۔

حق کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

— وہ چیز جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔ قیامت کو اسی معنی کے لحاظ سے حق کہا گیا ہے۔

— وہ چیز جو اخلاقی حیثیت سے واجب ہو۔ عدل کو اسی اعتبار سے حق کہا گیا ہے۔

— وہ چیز جو جھگڑے اور اختلاف کے درمیان قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن مجید کو حق کہنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

غایت اور مقصد کے مفہوم کے لیے بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان و زمین کی خلقت کو اسی معنی کے لحاظ سے بالحق کہا گیا ہے۔

— جو چیز اپنے ظہور کے لحاظ سے بالکل واضح اور مبین ہو اس کو بھی حق کہتے ہیں۔

آیت زیر بحث میں حق کا لفظ اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس آخری سوال کے ساتھ ان کی زبان سے وانا ان شاء اللہ لمھتدون (اور اب ہم انشاء اللہ پتہ لگا لیں گے) کے الفاظ نکلے۔ یہ الفاظ ان کے باطن پر عکس ڈالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پے بہ پے سوالات کے بعد خود ان پر بھی اپنے سوالات کی نامعقولیت واضح ہو چکی تھی چنانچہ ان کے اسی احساس کی

شاید یہ برکت تھی کہ ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور اس کلمہ کی برکت سے انھیں اس حکم کی تعمیل کی توفیق نصیب ہوئی ورنہ جس ذہنیت کا ان کی طرف سے اظہار ہو رہا تھا اس سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی اس حکم کی تعمیل کریں گے۔

واذ قتلتم نفسا فادّٰرءتم فيها والله مخرج ما كنتم تكتمون ‎ درء کے معنی دفع کرنے اور جھٹکنے کے ہیں۔ اسی سے تدارأتم ہے جو ادغام کے قاعدے سے ادارءتم ہو گیا ہے۔ اس کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کے ہیں۔

والله مخرج ما كنتم تكتمون : (اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو کچھ تم چھپاتے رہے ہو) یہاں بطور جملہ معترضہ کے ہے۔ اس کے بعد کا ٹکڑا فقلنا اضربوه ببعضها (پس ہم نے کہا کہ اس کو اس کے بعض سے مارو) فادارءتم فيها سے لگتا ہوا ہے۔ اس جملہ معترضہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قتل کرکے تم دنیا میں ایک دوسرے پر الزام بازی کرکے اس کو چھپانے کی کوشش کر سکتے ہو لیکن یاد رکھو کہ کوئی چیز اگر تم نے دنیا میں چھپائی تو وہ ہمیشہ چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ایک دن اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ ظاہر کرکے رہے گا جو تم چھپاتے رہے ہو۔

یہ واذ قتلتم سے گائے کے ذبح کے حکم کا اصل مقصد بیان ہو رہا ہے۔ اوپر یہ واضح کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جو آج خدائی شریعت کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، ان کی ذہنیت اس شریعت کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیا رہی ہے۔ وہ کس طرح قدم قدم پر اس کے قبول کرنے کے معاملہ میں طرح طرح کی حجتیں کرتے رہے ہیں۔ اب واذ قتلتم نفسا سے آگے کے حصہ میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ گائے کے ذبح کا یہ حکم کس مقصد سے دیا گیا تھا اور اس معاملہ میں انھوں نے کیا روش اختیار کی۔

فقلنا اضربوه ببعضها كذلك يحيي الله الموتى ويريكم اياته ‎ "اس کو اس کے بعض سے مارو۔" عام طور پر اہل تاویل نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ مقتول کو گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا چھوا دو جس سے وہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ اگرچہ یہ مطلب لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو یعنی مقتول پر قربانی کی ہوئی گائے کا خون چھڑکو اور آس پاس والوں سے

قسم لو۔ واقعہ کی تفصیل کے بجائے اس کی طرف صرف اشارہ اس لیے کافی سمجھا گیا ہو کہ یہاں مقصود واقعہ کو بیان کرنا نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے ایک واقعہ کو صرف جتا دینا تھا۔

یہ مطلب لینے کی صورت میں کذلک یحیی اللہ الموتی کا ٹکڑا بنی اسرائیل کی اس بات کا جواب ہوگا جو انھوں نے گائے ذبح کرنے کا حکم سن کر کہی تھی کہ اتتخذنا ھزوا (کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو) یعنی تمہارے نزدیک تو یہ حکم ایک مذاق ہے لیکن اگر تم اس پر اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ عمل کرو اور اس قربانی اور قسم میں ایمان داری برتو تو یہی راستہ ہے قاتلوں کے سراغ لگانے اور ان سے قصاص لینے کا جس میں سب کے لیے زندگی ہے۔

یہ بات کہ قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب ۱۷۹ بقرہ (اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو) تورات میں بھی ایک کے قتل کو سب کا قتل اور ایک کے قصاص کو سب کی زندگی قرار دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اس حکم کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۲۔ مائدہ)

ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس نے کسی جان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا ملک میں بدامنی برپا کی ہو اس نے گویا سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو زندہ کیا اس نے گویا سب کو زندہ کیا۔

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر قانون قصاص کا یہ فلسفہ واضح تھا کہ قصاص نہ لینے میں سب کی موت اور قصاص لینے میں سب کی زندگی ہے۔

ویریکم آیاتہ کا تعلق اس صورت میں جملہ معترضہ سے ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کی نشانیاں دکھا رہا ہے کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اس میں سے کوئی چیز بھی ڈھکی رہنے والی نہیں ہے بلکہ ہر چیز ظاہر ہو کے رہے گی۔ یہ اشارہ ان باتوں کی طرف ہوگا جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی اور جن کو چھپانے کے لیے دین میں طرح طرح کی تحریفیں کیں لیکن اب وہ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ایک ایک کرکے ظاہر ہو رہی تھیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی نشانی تھی کہ خدا سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش ایک بے سود کوشش ہے، وہ ایک دن

سارے رازوں سے پردہ اٹھا دے گا۔

ثم قست قلوبکم من بعد ذالک .... وما اللہ بغافل عما تعملون "پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے"۔ یہاں ثم کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ دین کے معاملہ میں تمہاری اسی قسم کی کٹھ حجتیوں اور فرار پسندیوں کا نتیجہ نکلا کہ تمہارے دل سخت ہوگئے۔ یہاں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح گائے کے ذبح کے حکم کی تعمیل میں بہت سی حجتیں پیدا کیں اسی طرح اس کے ذبح کے بعد بھی اس قربانی کا صحیح احترام ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جھوٹی قسمیں کھا کر قاتل کو چھپانے کی کوشش کی۔ کسی جرم کے ساتھ جب حیلہ بازی اور کٹھ حجتی اور پھر مزید براں ڈھٹائی اور جسارت بھی شامل ہو جائے تو ایسے مجرموں کے دل خدا کے قانون کے مطابق پتھر کے مانند سخت ہو جایا کرتے ہیں جس کے بعد نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی کی صلاحیت ان کے اندر بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ (پس وہ پتھر کے مانند ہوگئے یا پتھر سے بھی زیادہ سخت) یہ اسی طرح کا اسلوب ہے جیسا کہ دوسری جگہ وارد ہے اولئک کالانعام بل ھم اضل ۱۷۹۔ اعراف (یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ) یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ یکسر تعبیر حقیقت ہے۔ جمادات وغیرہ میں جو سختی ہوتی ہے وہ سختی ان کو ان صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی جو قدرت کی طرف سے ان کے اندر ودیعت ہوتی ہیں۔ برعکس اس کے انسان اگر اپنے آپ کو بگاڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ قانون الٰہی کے بموجب ان تمام صلاحیتوں سے اس کو محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اس کو ودیعت ہوئی ہوتی ہیں۔ پتھر سخت سے سخت ہو کر بھی پتھر ہی رہتا ہے اس کی رگوں کے اندر پانی کی سوت جاری کرنے کی صلاحیت اگر قدرت نے رکھی ہوئی ہے تو اس سختی کے باوجود یہ چیز اس کے اندر باقی رہتی ہے۔ برعکس اس کے انسان کا دل اگر کسی اخلاقی بیماری کے سبب سے سخت ہو جائے تو اس کے دل کی تمام سوتیں بالکل خشک ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسان کے بگاڑ کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ جو فرمایا کہ "پتھروں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل پڑتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خشیت الٰہی سے

گر پڑتے ہیں۔" یہ پتھروں کی انہی فطری صلاحیتوں کی طرف اشارات ہیں جو قدرت نے ان کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں اور جو بہرصورت باقی رہتی ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ محض کوئی شاعرانہ اسلوب بیان نہیں ہے جس کا واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ "تلمیح" ہے ان مشاہدات کی طرف جو صحرا کی زندگی میں خود بنی اسرائیل کی نگاہوں کے سامنے گزر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک چٹان سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹتے اور طور کے ایک حصہ کو تجلی الٰہی سے پاش پاش ہوتے دیکھا تھا لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ان کے اپنے دلوں کی سختی کا یہ حال رہا کہ وہ کسی نشانی کو بھی دیکھ کر نرم نہیں ہوتے تھے۔ پھر اس بات میں شبہ کرنے کی کہاں گنجائش رہی کہ ان کے دلوں کی سختی پتھروں اور چٹانوں کی سختی سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

وما اللہ بغافل عما تعملون: اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے رہے ہو یعنی اپنے شرف و تقدس، اپنی بڑائی اور بزرگی اور اپنے پاکیٔ دامن کی حکایت تو وہ بڑھائے جس کے کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے ہوں اور اس کے سامنے بڑھائے جو بے خبر اور بے علم ہو، جو ہر بات سے باخبر ہو اس کے سامنے اس قسم کے ادعا اور غرور سے کیا حاصل!

افتطمعون ان یؤمنوا لکم .... من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون: یہود سے خطاب کے بیچ میں یہ مسلمانوں کی طرف اسی طرح کا التفات ہے جس طرح کا التفات آیات ۶-۷ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آیات ۲۱-۲۹ میں بنی اسمٰعیل کی طرف گزرا ہے۔ اس التفات کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے نہ بددل ہوں اور نہ اس پر متعجب کہ یہ پڑھے لکھے اور دین و شریعت کے عالم لوگ اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن ایسے ٹیڑھے واقع ہوئے ہیں کہ ایک بات کو اپنے نبی کی زبان سے سننے اور اس کا مدعا واضح طور پر سمجھ چکنے کے بعد بھی اس میں ٹیڑھ پیدا کرتے رہے اور اس کو اس کے منشا کے بالکل خلاف سمت میں موڑتے رہے ہیں، جیسا کہ گائے کی قربانی کے حکم کے معاملہ میں تم نے سنا، کیا ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگوں یا ان کی تقلید کرنے والوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری سیدھی سے سیدھی بات بھی سیدھے طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

دوسرا مسلمانوں کو ان یہود کی بعض پس پردہ حرکات سے آگاہ کرنا تاکہ جو سادہ لوح مسلمان ان کے فریب کارانہ دعوائے ایمان سے دھوکے میں آ کر ان سے حسن ظن رکھنے لگے تھے یا ان سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہشمند تھے وہ متنبہ ہو جائیں کہ یہ تمام تر فریب کاری ہے، اس میں سچائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔

یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ: حَرَّفَ الشَّیءَ عن وجھہ کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے صحیح رخ سے موڑ کر دوسری سمت میں کر دینا۔ اسی سے حَرَّفَ القولَ یا حَرَّفَ الکلامَ ہے جس کے معنی بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں۔ اس بدل دینے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

— ایک بات کی دیدہ و دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔

— کسی لفظ کے طرز ادا اور قرأت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مورہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔

— کسی عبارت یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے ہجرت کے واقعہ میں یہود نے اس طرح ردوبدل کر دیا کہ خانہ کعبہ سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

— کسی ذو معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہو مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا گیا درآنحالیکہ اس کے معنی بندہ اور غلام کے بھی آتے ہیں۔

— ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو لیکن اس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیئے جائیں جو اس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔

اہل کتاب تحریف کی ان تمام قسموں کے مرتکب ہوئے اور قرآن نے ان کو ان سب کا مجرم گردانا ہے۔ موقع موقع کے لحاظ سے آگے اس کتاب میں ہر ایک کی تفصیل ضروری دلائل کے ساتھ ان شاء اللہ آئے گی۔ یہاں اجمال کے ساتھ صرف اس کی مختلف صورتوں کو اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ تحریف پر تحریف کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ دیدہ و دانستہ اور سمجھ بوجھ کر کی جائے۔ قرآن مجید نے اس کے ساتھ قید لگائی ہے من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون (بعد اس کے کہ انھوں نے اس کو سمجھ لیا اور

وہ جانتے تھے کہ وہ تحریف کر رہے ہیں) یہی علم و شعور ہے جو درحقیقت تحریف کو ایک سنگین جرم بناتا ہے اور اسی جرم کی سزا میں اس جرم کے مرتکبین اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے نورِ علم سے یک قلم محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا ..... قالوا اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم الایۃ "اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں" یعنی دین و ایمان کے اجارہ دار تنہا مسلمان ہی نہیں ہیں ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس قول سے ان کا مطلب جیسا کہ آیات ۸ - ۹ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں محض مسلمانوں کو دھوکا دینا ہوتا تھا۔ وہ اس قول کے ظاہر الفاظ سے مسلمانوں کو فریب دیتے تھے تاکہ مسلمان ان کے اوپر اعتماد کرنے لگیں لیکن خود اپنے ذہن میں وہ اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے نبیوں اور اپنے صحیفوں پر تو ایمان رکھتے ہی ہیں۔ اب ایمان اور کس چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس قسم کے پرفریب حیلوں کے دام میں آ کر ان سے کچھ اچھی امیدیں نہ لگا بیٹھیں اس لیے کہ ان لوگوں کی خلوت اور جلوت کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ سامنے تو یہ اٰمنّا کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب یہ اپنی خاص مجلسوں میں ہوتے ہیں تو وہاں آپس میں ایک دوسرے کا بڑی شدت سے محاسبہ کرتے ہیں۔ اگر اظہارِ رواداری کے جوش میں تمہارے سامنے ان میں سے کسی کی زبان سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو اسلام کے حق میں ہوتی ہے تو یہ اپنی مجلسوں میں اس پر سختی سے گرفت کرتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کے سامنے نبی آخر الزمان اور اسلام سے متعلق وہ باتیں کھولتے ہو جو خدا نے اپنے صحیفوں کے ذریعے سے صرف تم پر کھولی ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ تمہارے انہی بیانات کو مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت اور حجت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔[1]

اولا یعلمون ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون یوں تو یہ جملہ عام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و پوشیدہ کو جانتا ہے لیکن یہاں موقعِ کلام اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ دھوکا بازی کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس اٰمنّا اور اس کی حقیقت سے بھی

[1] اس موقع پر اسی سورہ کی تفسیر آیات ۸-۱۴، تدبر قرآن میں پڑھ لینی چاہیے۔ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہی مضمون دونوں جگہ بیان ہوا ہے۔

اچھی طرح واقف ہے جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کی خاص مجلسوں میں جو آپس میں ایک دوسرے کو مسلمانوں کے سامنے افشائے راز پر جو سرزنشیں اور ملامتیں ہوتی ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احمق لوگ مسلمانوں کے سامنے تو اپنے آپ کو ظاہرداری کے اس لبادہ میں چھپا سکتے ہیں لیکن اس خدا سے انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کیا تدبیر سوچی ہے جو ان کی خلوت و جلوت ہر جگہ موجود ہے اور جس پر ظاہر و خفی سب کچھ روشن ہے۔

ومنھم امیون لا یعلمون الکتٰب الا امانی وان ھم الا یظنون "امیّون" امی کی جمع ہے جس کے معنی تحریر و کتابت اور مدرسی تعلیم سے ناواقف کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔ ان کے علیحدہ ذکر کرنے سے یہاں یہ بات نکلتی ہے کہ اوپر کی آیتوں میں "فریق منہم" کے الفاظ سے جس گروہ کا ذکر ہوا ہے اس سے یہود کے پڑھے لکھے اور ہوشیار لوگ مراد ہیں۔ ان کی جو حرکتیں بیان ہوئی ہیں وہ بھی ہوشیاروں اور پڑھے لکھوں ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اللہ کے کلام میں تحریف کرنا اور مسلمانوں کو چکمہ دینے کی کوشش کرنا ظاہر ہے کہ عوام کالانعام کا کام نہیں ہو سکتا۔ عیاروں اور چالاکوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرنے اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے مایوس کرنے کے بعد اب یہ یہود کے عوام کا ذکر فرمایا اور یہ واضح کیا کہ مسلمانوں کو ان سے بھی قبولِ حق کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح پہلا گروہ شرارت اور حیلہ بازی میں مبتلا ہے اسی طرح یہ دوسرا گروہ بھی جھوٹی آرزوں اور اوہام میں مبتلا ہے۔

ان کی بیماری یہ بتائی ہے کہ لا یعلمون الکتٰب الا امانی (یہ تورات کو صرف اپنی آرزوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں) امانی امنیہ کی جمع ہے جس کے معنی آرزو، تمنا اور خواہش کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کی اصل حقیقت سے تو کچھ واقف نہیں کہ اس میں ان کو کیا تعلیم دی گئی ہے کیا نہیں دی گئی ہے بس ان کے ذہن میں کچھ تمنائیں اور خواہشات ہیں جو اگرچہ بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں لیکن ان کے علماء کی غلط تعلیم سے ان کے اندر رچی بسی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی کتاب کو اپنی انہی خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کتاب ان کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتی بلکہ صرف ان کی ان خواہشات کی سندِ تصدیق عطا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اس قسم کی بعض آرزوں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً :-

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً (۸۰ - بقرہ)

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔"

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ (۱۱۱ - بقرہ)

اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہودی یا نصرانی۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۹۴ - بقرہ

کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابیاں اللہ کے نزدیک دوسروں کے مقابل میں تمہارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۱۸ - مائدہ

اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

یہ ان کی آرزوؤں میں سے صرف چند بطور مثال ذکر ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اوہام میں مبتلا اور ایسے لذیذ خواب دیکھ رہے ہوں، جن پر ذمہ داری کا (چند رسوم کی ادائگی کے سوا) کوئی بوجھ بھی نہ ہو اور حقوق جن کے لیے سارے کے سارے خدا کے ہاں محفوظ ہوں، وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے کس طرح بن سکتے تھے جو ان کو ان لذیذ خوابوں سے بیدار کر کے زندگی کی حقیقتوں اور اس کی اصلی ذمہ داریوں کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا۔

وان ھم الا یظنون کا مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ تمام آرزوئیں محض ان کے اور ان کے علماء کے ذہن کی پیداوار ہیں، ان کو اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ... وویل لھم مما یکسبون اس سورہ کے شروع میں لفظ کتاب کی تشریح کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں شریعت کے احکام و قوانین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ فتوے اور احکام ہیں جو علمائے یہود بغیر کسی شرعی سند کے محض اپنے دنیوی اغراض اور اپنے عوام کو خوش رکھنے کے لیے جاری کرتے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ "اپنے ہاتھوں لکھنے" کا مطلب یہ ہے کہ ان فتووں کے پیچھے

کتاب الٰہی کے اندر کوئی بنیاد اور سند نہیں ہوتی تھی، محض ان کے طبع زاد اور من گھڑت فتوے ہوتے تھے لیکن وہ ان کو منسوب خدا اور اس کی شریعت کی طرف کرتے تھے۔ اسی طرح کے فتوے تھے جن سے ان کے عوام شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر ان اوہام میں مبتلا ہوئے جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اسی طرح ان کے دین میں ان چیزوں کی ملاوٹ ہوئی جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

لیشتروا بہ ثمنا قلیلا۔ (تاکہ اس کے عوض حقیر قیمت حاصل کریں) حقیر اس لیے کہ یہ دین فروشی وہ محض اپنے دنیوی اغراض کے لیے کرتے تھے اور دنیا کا بڑا سے بڑا فائدہ بھی اگر دین کو فروخت کر کے حاصل کیا جائے تو بہرحال وہ حقیر ہی ہے۔

فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون۔ (ان کے لیے ہلاکت ہے اس چیز کے سبب سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور اس چیز کے سبب سے بھی جو وہ اس کے عوض میں کماتے ہیں) یعنی آخرت میں یہ دونوں چیزیں ان کے لیے الگ الگ خرابی اور تباہی کا سبب بنیں گی۔ ان کا یہ اپنے جی سے شریعت تصنیف کرنا بھی سبب تباہی اور اس کے عوض میں دنیوی منافع حاصل کرنا بھی موجب تباہی!

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ الایۃ "اور وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی" یہ ان جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ یہود اپنے لیے کسی صورت میں ابدی عذاب دوزخ کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جنت و دوزخ کو اعمال کا نتیجہ اور اعمال پر مبنی سمجھنے کے بجائے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ خدا کی برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے خواہ ان کے اعمال کچھ ہوں، اول تو وہ دوزخ میں بھیجے ہی نہیں جائیں گے اور اگر بھیجے بھی گئے تو معمولی طور پر کچھ سزا بھگت کر جنت کو واپس کر دیے جائیں گے۔ ان کے اس واہمہ نے ان کے عوام اور خواص سب کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا کر دیا۔ نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد عمل اور عقیدہ کے بجائے اپنی گروہی نسبت پر رہ گیا تھا اور بدقسمتی سے ہم مسلمان بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ "یا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر رہے ہو جو جانتے نہیں۔"

جانتے نہیں، یعنی جس کی سند تمہاری کتاب میں موجود نہیں۔ بس ایک بات تم نے اپنے جی سے گھڑ کر اپنے خدا کی طرف منسوب کردی ہے۔ حالانکہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم خدا کی طرف حق بات کے سوا کوئی بات منسوب نہیں کروگے۔ اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْکِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ

(۱۶۸۔ اعراف)

بلیٰ من کسب سیئۃً واحاطت بہ خطیئتہ ... ھم فیھا خالدون یہ یہود کے اسی واہمہ کی تردید ہے جس کا ذکر اوپر گذرا۔ یعنی جنت اور دوزخ کا تعلق خاندانی اور گروہی نسبتوں سے نہیں بلکہ تمام تر عمل سے ہے۔ جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اس کو اپنے گھیرے میں لے لے تو اس کے لیے خلود فی النار ہے خواہ اس کا تعلق کسی گروہ سے ہو۔ برعکس اس کے جو شخص ایمان اور عمل صالح کی روش پر قائم رہے اس کے لیے خلود فی الجنۃ ہے خواہ اس کا تعلق کسی خاندان سے ہو۔

جس طرح اسی سورہ کے پہلے سلسلہ بیان کے خاتمہ پر ان الذین امنوا والذین ھادوا الآیۃ والی آیت وارد ہوئی تھی اسی طرح اس دوسرے سلسلہ بیان کے خاتمہ پر یہ بلیٰ من کسب الایۃ والی آیت وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں آیتوں کا موقع اور مقصد بالکل ایک سا ہے اس وجہ سے ان دونوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مکتبہ میثاق کی پہلی پیشکش

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر

تدبر قرآن

تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ

اس کتاب کو خود پڑھیے اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کیلیے دیجیے تاکہ قرآن مجید کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہو۔

تقطیع ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۳۶ - ہدیہ ۷۵ پیسے علاوہ محصول ڈاک - محصول ڈاک ۴۷ پیسے

ملنے کا پتہ: مکتبہ میثاق رحمان پورہ، اچھرہ لاہور

مطالعہ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

سنتِ نبوی اور خلفاء راشدین

ذیل کے مضمون میں ان روایات کی تشریح کی گئی ہے جن کی بنا پر عام طور پر منکرین سنت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اپنا ہم نوا اور ہم مسلک قرار دیتے ہیں۔ ضمنی طور پر بعض دوسرے مباحث بھی آگئے ہیں۔ (ع ۔ غ ۔ ح)

عن ابن عباسؓ لما اشتد بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ قال عمرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبہ الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا فاختلفوا وکثر اللغط۔ قال قوموا عنی ولا ینبغی عندی التنازع

صحیح بخاری مصری باب کتابۃ العلم ج ا ص ۳۲

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد جب شدت اختیار کرگیا تو آپ نے ارشاد فرمایا میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ میں کچھ لکھوا دوں تاکہ بعد میں تم گمراہی میں مبتلا نہ ہونے پاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کی شدت کا غلبہ ہوگیا ہے ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے وہ کافی ہے صحابہ میں اختلاف پیدا ہوا اور شور بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ میرے پاس نزاع مناسب نہیں ہے۔

•

صحیح مسلم کی روایت میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں۔ وقالوا ما شانہ اھجر استفھموہ۔ قال دعونی فالذی انا فیہ خیر اوصیکم بثلاث اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب

واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم قال وسکت عن الثالثۃ او قالھا فانسیتھا
ج ۲ ص۴۲۹ باب ترک الوصیۃ حاضرین نے کہا کیا آپ (دنیا کو) چھوڑ چلے ہیں، دریافت تو کرلو۔ (بعض روایات میں یہ الفاظ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں) راوی کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو میں جس حال میں ہوں وہ بہتر ہے، میں تمہیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں (۱) مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کرو، (۲) غیر ملکی یا قبائلی وفود (مہمانوں) کی اسی طرح عزت کرو جس طرح میں کرتا رہا ہوں۔ حضرت ابن عباس کے شاگرد سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ تیسری بات کے ظاہر کرنے سے یا تو حضرت ابن عباس خاموش رہے یا مجھے یاد نہ رہی۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں، ائتونی بالکتف والدواۃ او اللوح والدواۃ یعنی شانے کی ہڈی اور دوات یا تختی اور دواۃ (لکھنے کا سامان) لے آؤ تاکہ میں کچھ لکھوا دوں۔

اس حدیث کے مطالعہ کے وقت مختلف قسم کے سوالات ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

(۱) آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے کہ جس کی بنا پر گمراہی کا امکان باقی نہ رہتا۔

(۲) ضلالت سے کیا مراد ہے؟ کیا حاضرین کے اختلاف و نزاع کی وجہ سے پیغمبر کے لیے جائز ہے کہ وہ ایسی بات کو ظاہر نہ کرے جس کی بنا پر امت ضلالت سے بچ سکے۔

(۳) بعض صحابہ خصوصاً حضرت عمرؓ نے آپ کے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی؟

(۴) اس موقع پر صحابہ کے اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟

(۵) ھجر کے معنی عام طور پر ہذیان کے لیے جاتے ہیں کیا اس میں گستاخی اور سوء ادبی کا پہلو نہیں پایا جاتا، کیا اس قسم کے کلمات صحابہ خصوصاً حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلنے کسی درجہ میں بھی مناسب تھے؟

(۶) حضرت عمرؓ کے قول حسبنا کتاب اللہ سے کیا مراد ہے؟ کیا ان کا یہ ارشاد مسلک انکار سنت کی تائید نہیں کر رہا ہے؟

سوال ۱، ۲، ۳ کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ آپ کے فرمان "لا تضلوا بعدہ" سے یہی سمجھے تھے کہ لا تجتمعون علی الضلالۃ ولا تسری الضلالۃ الی کلکم، یعنی جو چیز میں لکھوانا چاہتا ہوں اس کی

بنا پر پوری امت اجتماعی طور پر ضلالت سے محفوظ رہے گی نہ کہ ہر ہر فرد گمراہی سے امن میں رہے گا۔ کیونکہ انفرادی طور پر ضلالت کے بارے میں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ارشادات موجود ہیں جن کی بنا پر افراد کی گمراہی کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً روایات میں ملتا ہے کہ ستفترق الامۃ کہ امت کئی فرقوں میں بٹ جائے گی یا مثلاً آپ نے فرمایا "ملت کے مجموعی نظم میں سے لوگ خروج کریں گے اور قسم قسم کے فتنے ظہور میں آئیں گے"۔

باقی رہا پوری امت کا ضلالت پر مجتمع اور متفق ہو جانا تو اس کی نفی پر کتاب و سنت کی واضح نصوص موجود ہیں۔

(۱) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
سورہ نور پ۱۸

تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہیں اللہ تعالیٰ ضرور ہی ان کو زمین میں منصب خلافت عطا فرمائے گا۔

(۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
پ۴ سورہ آل عمران

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو

(۳) لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ،

میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی (ترمذی مشکوٰۃ ص۳۰)

(۴) لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق اوکما قال بخاری مسلم مشکوٰۃ ص۵۸۳

میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا جس کو راہ حق پر استقامت حاصل ہوگی۔

ان واضح شواہد و دلائل کے ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ یہ کیسے سمجھ سکتے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس آخری مرض میں جس تحریر کے لکھوانے کا ارادہ فرمایا ہے اگر اسے قلم بند نہ کیا گیا تو امت گمراہ ہو جائے گی بلکہ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی احتیاط اور امت پر کمال شفقت و رحمت کی وجہ سے کچھ نصائح لکھوانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس چیز کو بھانپ لیا اور معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچ گئے۔ اسی بنا پر آنحضورؐ کے درد کی شدت کو دیکھتے ہوئے رائے ظاہر کی

کہ اس وقت دوات قلم لا کر آپ کی تکلیف میں اضافہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کو یہ یقین تھا کہ اللہ کی کتاب جب تک ہمارے درمیان موجود ہے امت مجموعی طور پر گمراہ نہیں ہو سکتی۔ یہ عدول حکمی، یا ارشاد نبویؐ سے سرتابی نہ تھی بلکہ آپ کو زحمت سے بچانے کے لیے اپنی خیرخواہی اور مخلصانہ محبت کا اظہار تھا۔

اسی صورتِ حال سے ملتا جلتا واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے جب کہ مشرکین کے اعتراض کی بنا پر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا کہ محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھ دیں، لیکن انھوں نے لفظ رسول اللہ کے مٹانے سے انکار کر دیا تھا، یہ نافرمانی نہ تھی بلکہ ادب و احترام اور اخلاص و محبت کا پہلو غالب تھا (صحیح بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ یہ یقین تھا کہ امت مجموعی طور پر گمراہ نہ ہوگی اس کے باوجود آپ کا یہ فرمانا کہ "میں کچھ لکھوا دوں تاکہ تم گمراہ نہ ہو"۔ اس فرمان کی جو توجیہ و تشریح کی گئی ہے یہ کوئی انوکھی نہیں ہے۔ سیرت میں اسی قسم کے دوسرے واقعات بھی ملتے ہیں۔

اسی نوعیت کا ایک نمونہ غزوہ بدر کے موقع پر ملتا ہے۔ جنگ بدر میں فتح و کامرانی کا وعدہ خدا کی طرف سے ہو چکا تھا۔ اس غزوہ میں مارے جانے والے مشرکین کے گرنے کی جگہیں بھی آپ کو بتا دی گئی تھیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے انتہائی الحاح و تضرع سے (گڑگڑا کر) دعا کی اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا، حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ آپ کی اس مشقت اور آہ و زاری پر صبر نہ کر سکے اور ان کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات نکل گئے "آپ کب تک یہ مشقت برداشت کریں گے، اب اس الحاح و تضرع کو ختم فرمائیں، اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا"

جس طرح یہاں حضرت ابوبکرؓ نے کمالِ محبت اور انتہائی وفادارانہ جذبہ کی بنا پر طویل مناجات کے سلسلے کے ختم کرنے کی درخواست کی اسی طرح حضرت عمرؓ کو بھی اسی جذبہ نے مجبور کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شدید مرض کی حالت میں لکھنے، لکھوانے اور املا کرانے کی زحمت سے بہر حال محفوظ رہیں۔

نیز جس طرح غزوہ بدر کے موقع پر کامل فتح و نصرت کے الٰہی وعدے کے باوجود آپ نے طویل عرصہ تک سلسلہ دعا و مناجات جاری رکھا اور اس بنا پر انتہائی مشقت برداشت کی ٹھیک اسی طرح مرض الموت میں اسی علم کے باوجود کہ امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی آپ نے سامانِ کتابت لانے کا حکم صادر فرمایا (مستفاد از تعلیقات السندیؒ علی البخاری)

مذکورہ بالا تفصیلات کی تائید میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد آپ کے مرض میں تخفیف ہوئی اور کئی دن تک آپ بقیدِ حیات رہے، اس کے باوجود آپ نے دوبارہ قلم دوات طلب نہ کی، اگر واقعی کوئی ضروری وصیت پیش نظر تھی تو ان ایام میں اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔ انبیاء کرام کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ محض چند افراد کے اختلاف و نزاع کی بنا پر فریضۂ تبلیغ کی ادائگی میں کوتاہی کریں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری مصری ج ۱ ص۱۶۹)

سوال ۲ کے جواب میں یہ ہے کہ دین کے بارے میں اختلاف تین قسم کا ہو سکتا ہے :-

(۱) وجود خالق اور اس کی وحدانیت کے بارے میں اختلاف، یہ صریح کفر ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں اختلاف، یہ بدعت ہے۔

(۳) ایسے فروعی مسائل میں اختلاف جن کے بارے میں ایک سے زیادہ کا احتمال خود کتاب و سنت کے الفاظ میں موجود ہے۔ یہ اختلاف امت کے لیے زحمت کے بجائے رحمت کا باعث ہے۔ اسی قسم کے اختلاف کو حدیث میں اختلافُ امتی رحمۃٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی شرح مسلم ج ۲ ص۲۴۳ کلام خطابیؒ)

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسا کہ حدیث لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدٌ کُمْ صَلٰوۃَ الْعَصْرِ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ کے فہم میں ہو گیا تھا (یعنی تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ کے علاقے میں پہنچ کر) واقعہ یہ ہوا کہ صحابہ جب اس ارشاد کو سن کر مدینہ سے روانہ ہوئے تو راستہ ہی میں عصر کا وقت ہو گیا۔ اس موقع پر ایک گروہ نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر اصرار کرتے ہوئے بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچ کر ہی نماز قضا کی۔ یہ لوگ عشا کے بعد ہی مقررہ مقام پر پہنچ سکے (زاد المعاد ج ۱ ص۳۲۸) دوسرے گروہ نے حدیث کے اصل منشا کو پیش نظر رکھتے ہوئے راستہ ہی میں بروقت نماز ادا کی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ سارا معاملہ پیش ہوا تو آپ نے کسی کو بھی ملامت نہ کی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ فہم و اجتہاد کے اختلاف کی بنا پر کسی کو بھی زجر و توبیخ اور طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا بشرطیکہ نیت خالص اور مقصد صالح پیش نظر ہو (فتح الباری ج ۱ صفحہ ۱۴۹)

سوال ۵ کا جواب "ہجر" کے کئی معنی آتے ہیں۔ اگر اسے ہُجر سے مشتق مانا جائے تو اس کے معنی ہذیان کے ہوں گے اور اگر ہجرت ہجران سے ماخوذ ہو تو اس کے معنی مفارقت اور ترک وطن کے ہوں گے، اس حدیث میں دوسرے معنی مراد لینا صحابہ کے زیادہ شایان شان ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک لفظ کے صحیح معنی بن سکتے ہیں تو بلاوجہ ایسے معنی مراد لینا جس سے بے ادبی کا پہلو نکلے مناسب نہیں ہے ظنّ المؤمنون والمؤمنات بانفسهم خيراً، یہ ربانی ہدایت اس موقع پر نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے۔

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی آپ دنیا کو چھوڑ چلے ہیں؟ اور کیا یہ آپ کی زندگی کے آخری لمحات ہیں؟ آپ سے دریافت کر لیا جائے، اگر واقعی صورت حال یہی ہے تب تو تعمیل ارشاد فوراً ضروری ہے ورنہ درد کی شدت کا خیال کرتے ہوئے مرض میں تخفیف کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ اس تشریح سے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی وابستگی اور انتہائی مخلصانہ محبت ظاہر ہوتی ہے نہ کہ گستاخی اور سوء ادبی کا پہلو۔

سوال ۶ کا جواب: حسبنا کتاب اللہ حضرت عمرؓ کا یہ جملہ عام طور پر منکرین سنت کی زبان پر چڑھا ہوا ہے، وہ اسے اپنے مسلک کی حمایت میں زور شور سے پیش کرتے ہیں لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ حضرت عمرؓ ہوں یا دوسرے خلفاء راشدین ان کے مسلک کو متعین کرنے کے لیے ایک دو مبہم اقوال سے استناد کرنے کے بجائے ضروری ہے کہ ان کے زندگی کے مجموعی طرز عمل کو دیکھتے ہوئے اصل حقیقت کا سراغ لگایا جائے۔ حسبنا کتاب اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک شریعت کے بنیادی اصول کا تعلق ہے وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ باقی رہا جزئیات اور تفصیلات کے تعین اور وضاحت کے لیے سنت کی طرف رجوع کرنا تو یہ ایک ایسا اصول ہے کہ اس پر خود حضرت عمرؓ شدت کے ساتھ کاربند تھے۔ چند اقوال و آثار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ قال عمر بن الخطابؓ، سیأتی قوم یجادلونکم بشبهات القرآن، فخذوهم بالسُّنَنِ فان اصحاب السُّنَنِ اَعْلَمُ بکتاب الله مقدمہ المیزان للشعرانی مطبعہ قاہرہ صفحہ ۵۱

تمہارے پاس کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن کے بارے میں شبہات پیدا کر کے تم سے بحث و مناظرہ کریں گے۔ ان لوگوں پر روایات کے ذریعہ گرفت کرو، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ علماء سنت، قرآن مجید سے زیادہ باخبر ہیں۔

•

۲۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سنت کے بارے میں کیا موقف تھا اس کی وضاحت میمون بن مہران کے اس بیان سے ہوتی ہے۔

"حضرت ابوبکرؓ کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی فیصلہ طلب معاملہ آتا تو پہلے کتاب اللہ میں غور فرماتے اگر اس میں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، ورنہ سنت نبوی کی طرف رجوع کرتے، اگر یہاں بھی ناکامی ہوتی تو صحابہ کرام کو جمع کر کے ان سے دریافت فرماتے، حضرت عمرؓ کا طریق کار بھی اسی سے ملتا جلتا تھا۔" (اعلام الموقعین امام ابن قیمؒ ج ۱ صفحہ ۴۳)

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:-

اطیعونی ما اطعت الله ورسوله فاذا عصیت الله ورسوله فلا طاعة لی علیکم (بدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۳۰۱)

میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی سنت پر کاربند رہوں، اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہ ہوگی۔

اس خطبہ میں اطاعت رسول سے سنت ہی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ قرآن کی اطاعت کا ذکر تو پہلے ہی "ما اطعت الله" میں مذکور ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ رُواۃ کے لحاظ سے یہ خطبہ قابل اعتماد ہے اس کی سند صحیح ہے۔

اس خطبہ کے الفاظ سے اس وہم کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا لفظ صرف زندہ شخصیت ہی کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر جیسے اہل زبان، اطاعت کا لفظ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے لیے بول رہے ہیں۔

(۳) ان عمر بن الخطاب کان یقول اصحاب الرأی اعداء السنن اعیتهم الاحادیث ان یعوها، و استحیوا حین سئلوا ان یقولوا لا نعلم فعارضوا السنن برأیهم فایاکم وایاهم (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۵)

رائے اور قیاس کے دلدادہ سنت کے دشمن ہیں، احادیث کا یاد رکھنا ان کے لیے دشوار ہوگیا ہے جب کوئی ان سے مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے تو ان کو "لا نعلم" (ہم نہیں جانتے) کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی آراء اور دماغی اختراعات کو سنت کے مقابلہ میں لے آتے ہیں ان سے دور رہو۔

۴۔ قال عمرؓ ردّوا الجهالات الی السنة (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۷)

جن باتوں کا علم نہ ہو ان کو سنت کی طرف لوٹاؤ۔

۵۔ قال عمرؓ تعلموا الفرائض والسنة کما تتعلموا القرآن (جامع بیان العلم ابن عبد البر ج ۲ ص ۱۲۳)

حضرت عمرؓ نے فرمایا احکام وراثت اور سنت اس طرح سیکھو جس طرح قرآن سیکھتے ہو۔

عملی نمونے | اب تک حضرات شیخین (ابوبکرؓ، عمرؓ) کے چند اقوال پیش کیے گئے ہیں جو قابل اعتماد دلائل کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں، اب ذیل میں چند عملی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

۱۔ امام بخاری کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء اسلام مباح امور میں قابل اعتماد اہل علم سے مشورہ لیا کرتے تھے تاکہ سہل ترین راہ اختیار کرسکیں۔ جب کتاب و سنت کا واضح حکم سامنے آجاتا تو پھر دوسری چیز کی طرف رُخ نہ کرتے اور یہ محض اس بنا پر کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرۂ اقتدار سے باہر نہ ہونے پائیں۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے (حدیث رسول پیش کرتے ہوئے) ٹوکا کہ آپ ان پر کیسے فوج کشی کرسکتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ارشاد ہے مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک کہ وہ کلمہ پڑھ لیں۔ اس طرح مجھ سے وہ اپنی جانیں اور مال محفوظ کرلیں گے، مگر یہ کہ اسلام کا کوئی حق ان سے وابستہ ہو۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مشورہ کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کے قائلین کے بارے میں حکم رسول موجود تھا، یہ لوگ دین کے احکام بدلنا چاہتے تھے۔ آپ کا فرمان ہے من

بدّل دینه فاقتلوه، جو اپنا دین تبدیل کرے اُسے قتل کر ڈالو۔ (بخاری مصری ج ۴ ص ۱۸۲)

اس سلسلے میں غور طلب معاملہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مانعین زکوٰۃ سے جہاد و قتال کرنے سے حدیث کی بنا پر روکا تھا، اب اگر حضرت ابوبکرؓ حدیث کو تاریخ دین سمجھتے تھے تو صاف طور پر کہنا چاہیے تھا کہ یہ کیا تم حدیث پیش کر رہے ہو قرآن لاؤ، اس کے بجائے انھوں نے حدیث کا اصل مطلب بیان کیا جس سے حضرت عمرؓ کی غلط فہمی بھی رفع ہوگئی اور ان کی پیش کردہ روایت کا مفہوم سامنے آگیا۔

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد جب دور صدیقی میں حضرت فاطمہ اور حضرت عباس نے اپنے اپنے حصہ کا مطالبہ کیا اور ازواج مطہرات نے حضرت عثمان کے ذریعہ اپنا حق وراثت طلب کیا (بخاری مسلم) تو ابوبکرؓ نے سب کو ایک ہی حدیث سنا کر مطمئن کر دیا یعنی لا نورث ما ترکنا صدقة انبیاء کرام کا متروکہ مال میراث کے طور پر تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ وہ امت کے غرباء و مساکین کا حق ہے (بخاری مسلم، مشکوٰۃ ص ۵۵۰) حضرت فاطمہؓ نے ابتداءً اس پر اصرار کیا تھا لیکن بعد میں وہ بھی راضی ہوگئیں (بیہقی ج ۶ ص ۳۰۱)

حضرت ابوبکرؓ کے اس طرز عمل پر نہ حضرت عمر نے انکار فرمایا اور نہ دوسرے صحابہ نے کسی قسم کے اختلاف کا اظہار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پاکیزہ دور میں سنت کے شرعی ماخذ ہونے پر سب کا اتفاق و اجماع تھا اور سب کے نزدیک یہ طریقہ "سبیل المؤمنین" کی حیثیت رکھتا تھا۔

۳۔ حضرت عمرؓ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اس کی بیوی حصہ پائے گی یا نہیں؟ حضرت عمر اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس موقع پر ضحاک بن سفیان حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوشتہ موجود ہے کہ آپ نے اشیم ضبابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت میں حصہ دار ٹھہرایا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ سے رجوع کرلیا اور حدیث کے مطابق حکم صادر فرمایا۔ ابوداؤد، موطا امام مالک ص ۲۳۹ باب میراث العقل۔

۴۔ حضرت ابوبکرؓ سے جب دادی کے حق وراثت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے صحابہ سے دریافت کیا تو اس موقع پر محمد بن مسلمہؓ اور مغیرہ بن شعبہ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ

دلوایا ہے۔ موطا امام مالک صفحہ ۳۲۵

۵۔ اسی طرح جنین کی دیت کے بارے میں حضرت عمرؓ حمل بن مالک کی روایت قبول کر لیتے ہیں اس موقع پر حضرت عمرؓ نہ تو ضحاک بن سفیان سے کہتے ہیں کہ بھائی تم نجد کے رہنے والے ہو تمہیں ان روایات کا کیا علم؟ اور نہ آپ حمل بن مالک سے فرماتے ہیں کہ تم تہامہ کے باشندے ہو تم کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا بہت کم موقع ملا، لیکن یہ کیا بات ہے کہ تمہاری یہ روایتیں مہاجرین و انصار کے علم میں نہ آئیں اور تمہیں یہ شرف حاصل ہو گیا۔

ایک شخص کی روایت کے بارے میں بھول چوک کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ بیان کرنے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کی روایت کو بغیر کسی رد و قدح کے قبول فرما لیا۔

زیرِ عنوان حدیث کی مناسبت سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اقوال و آثار کی تفصیل تو کافی حد تک ناظرین کے سامنے آ چکی ہے۔ لگے ہاتھوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا موقف بھی سنت کے بارے میں واضح کر دیا جائے۔

حضرت عثمان اور حدیثِ نبوی (۶) حضرت عثمانؓ کا خیال تھا کہ جس عورت کا شوہر مر جائے وہ جہاں چاہے عدت گذار سکتی ہے لیکن جب ابوسعید خدری کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرے شوہر کے قتل ہونے پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے شوہر کے مکان پر عدت گذارنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس حدیث کے مطابق اپنی رائے کو بدل لیا (موطا امام مالکؒ باب مقام المتوفی عنہا زوجہا)

حضرت علیؓ اور سنت نبویؐ حضرت علیؓ کے پاس چند مرتد افراد لائے گئے آپ نے ان کو آگ میں جلا ڈالنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن عباس نے حدیث پیش کی کہ من بدّل دینہ فاقتلوہ یعنی جو اپنا دین بدل ڈالے اُسے قتل کر دو، یہاں قتل کا حکم ہے نہ کہ جلا ڈالنے کا حضرت علیؓ نے یہ حدیث سن کر فرمایا صدق ابن عباس (ابن عباسؓ نے سچ کہا ہے) ترمذی ابواب الحدود صفحہ ۲۶۱ مجتبائی دہلی)

احادیث جلانے کا واقعہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف یہ بات بھی منسوب کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں احادیث کے مجموعے جلا ڈالے تھے لیکن یہ دونوں واقعات سند کے لحاظ سے انتہائی ناقابلِ اعتماد ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ والی روایت میں ایک راوی علی بن صالح مدنی ہے جس کو محدثین نے مستور الحال قرار دیا ہے یعنی اُس کے احوال و کوائف معلوم نہیں ہو سکے، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ (تقریب التہذیب) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ ج ا صفحہ ۵ پر اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس کی سند پر جرح بھی کر دی ہے لیکن افسوس ہے کہ انکارِ سنت کے حامی اس روایت کو تو بڑے زور شور سے نقل کر جاتے ہیں لیکن مصنف کتاب نے اس پر جو جرح کی ہے اس کا نام تک نہیں لیتے، آخر یہ کونسی دیانت اور کہاں کا انصاف ہے؟

اگر بالفرض اس روایت کو درست بھی مان لیا جائے تب بھی یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابوبکرؓ حدیث کو حجت تسلیم نہیں کرتے تھے، ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی دوسری وجہ ہو، جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں مستند روایات میں ملتا ہے۔

وقال عثمان للرهط القرشيين الثلاثة، اذا اختلفتم انتم و زيد بن ثابت في شيئ من القرآن فاكتبوه بلسان قريش، فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتىٰ اذا نسخوا الصحف في المصاحف ردّ عثمان الصحف الىٰ حفصة وارسل الىٰ كل افق مصحف مما نسخوا وامر بما سواه من القرآن في كل مصحف او صحيفة ان يُحرق

حضرت عثمان نے (اپنے دورِ خلافت میں مسلمانوں کو اختلافِ قرأت سے بچانے کے لیے) تین قریشی صحابہ عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبداللہ بن الحارث سے فرمایا کہ اگر تمہارے اور زید بن ثابت کے درمیان اختلاف ہو جائے تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھو، اس لیے کہ قرآن ان کی زبان ہی میں نازل ہوا ہے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا، جب قرآن کے اجزاء کو مصاحف میں لکھ چکے تو حضرت عثمانؓ نے اصل قرآنی اجزا حضرت حفصہ کے پاس واپس بھجوا دیے

بخاری مصری مع حاشیہ السندی ج ۳ ص ۲۲۶ باب جمع القرآن

اور ان کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں میں بھیج دیں ان کے علاوہ جو مصاحف بچے ان کے جلانے کا حکم دے دیا۔

اس روایت کے مضمون کو منکرین حدیث کے مشہور رہنما حافظ اسلم صاحب جیراج پوری نے بھی تسلیم کیا ہے، لکھتے ہیں:

"بیان کیا جاتا ہے کہ مصحف اصلی کی نقل لینے کے بعد حضرت عثمانؓ نے متفرق صحیفوں کو جو لوگوں کے پاس تھے اور صحیح قرأت کے مطابق نہ تھے جلا ڈالنے کا حکم دے دیا، بعض فرقے اس کو حضرت عثمانؓ کے معائب میں بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان پر تحریق کا الزام لگاتے ہیں لیکن عقل کے نزدیک اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کا یہ فعل مستحسن تھا کیونکہ ان اجزاء سے اختلاف قرأت کا اندیشہ تھا جس سے وہ امت کو بچانا چاہتے تھے۔ اس لیے ایسی حالت میں جب کہ باتفاق صحابہ قرأت صحیحہ کے مطابق قرآن لکھ دیا گیا۔ ان اختلافی سواد کا جلا دینا امت پر بہت بڑا احسان تھا۔" تاریخ القرآن ص۶۰

اس اقتباس میں خط کشیدہ الفاظ انتہائی غور طلب ہیں کیا جس طرح قرأت صحیحہ پر صحابہ کرام نے اتفاق کیا اور اس کو منکرین سنت نے بھی حجت تسلیم کیا، تو کیا ٹھیک اسی طرح کا اتفاق سنت کے حجت ماننے پر صحابہ کرام کے درمیان نہیں پایا جاتا، کیا اس کی مخالفت میں کسی ایک صحابی کا قول پیش کیا جا سکتا ہے؟ پھر لطف یہ ہے کہ قرآن کی قرأت صحیحہ پر اتفاق کا علم بھی کس طرح ہوا، اسی روایت در روایت کے ذریعہ جس پر منکرین سنت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ابن سعدؒ نے طبقات ج ۵ میں نقل کیا ہے۔ "الاحادیث کثرت علی عھد عمرؓ فانشد الناس ان یأتوہ بھا فلما اتوہ بھا امر بتحریقھا یعنی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں احادیث کثرت سے پھیل گئی تھیں حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسم دے کر کہا وہ احادیث ان کے پاس لائیں۔ جب لوگ ان کے پاس احادیث لے کر پہنچے تو وہ ان کو جلا ڈالتے۔"

یہ واقعہ بھی سند کے لحاظ سے ناقابل اعتماد ہے، یہ روایت منقطع ہے۔ حضرت عمرؓ سے اس واقعہ کے راوی حضرت ابوبکرؓ کے پوتے قاسم بن محمد ہیں۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کا زمانہ ہی نہیں پایا۔ قاسم کی ولادت ۳۶ھ میں ہوئی ہے یعنی حضرت عمرؓ کی شہادت کے تیرہ سال بعد۔ اس روایت کی سند میں ایک کڑی غائب ہے جب تک اس کا علم نہ ہو اور اس کی ثقاہت قابل اعتماد نہ ہو یہ روایت بھی ناقابل قبول ہے۔ اگر کسی درجہ میں اس روایت کو قبول بھی کر لیا جائے تو بھی حضرت عمرؓ کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے اس اقدام کو احتیاط پر محمول کیا جائے گا۔ یعنی ان کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ بے احتیاطی کے ساتھ حدیث رسول بیان کرنے میں بے باک ہو جائیں جیسا کہ دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا اقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آنحضور سے روایت کم بیان کرو۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۷)

اس قسم کی ضعیف اور ناقابل اعتماد روایات و آثار اور بھی ہیں جن کو پیش کر کے عام طور پر منکرین سنت کی طرف سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔ ان کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر عرض کی جائے گی انشاءاللہ۔

اس حدیث زیر عنوان سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کا حکم عارضی تھا اس روایت سے غیر قرآن لکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ واقعہ آپ کی زندگی کے آخری دور میں پیش آیا اس لیے علماء امت کے نزدیک اس کو سابقہ ممانعت کا ناسخ قرار دیا گیا ہے۔ فللہ الحمد

تزکیۂ نفس

(حصہ اول و دوم ایک جلد میں)

مولانا امین احسن اصلاحی کی — معرکۃ الآرا تصنیف — زبان نہایت شگفتہ۔ طرز استدلال نہایت دل نشین۔ ضخامت میثاق کے سائز کے ۲۲۳ صفحات، سستا ایڈیشن،

قیمت صرف ۳ روپے ۷۵ پیسے۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ، لاہور

اجتماعیات وسیاسیات

مولانا مبین جلال الدین صاحب انصر عمری

اسلام کا شورائی نظام

(۷)

انسدادِ فتنہ کے لیے شوریٰ

حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں ملک کے چاروں طرف فتنہ وفساد کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور تمام علاقوں سے بدامنی اور انتشار کی مسلسل اطلاعات مرکزِ خلافت کو پہنچ رہی تھیں ان نازک حالات میں بھی خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ نے جمہوریت کی رُوح کو کوئی صدمہ پہنچنے نہیں دیا، حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے آپ نے اہلِ مدینہ کو مدعو کیا اور مرکزِ خلافت کو پہنچنے والی اطلاعات کے اسبابِ علل کی تحقیق کی، اس وقت حضرت عثمانؓ اہلِ مدینہ سے فرماتے ہیں انتم شُرَکَائی وَشُهُودُ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاَشِیْرُوْا عَلَیَّ یعنی تم چونکہ مومنین کے نمائندے اور ان کے سردار ہو اس لیے میرے شریک کار ہو اور خلافت کی ذمہ داری میں ہم سب شریک ہیں۔ لہٰذا ہم سب کو مل جل کر اس معاملے کے صحیح اسباب کی چھان بین کرنی چاہیے۔ بس تم اپنے مشوروں سے میرے اس کام میں مدد کرو تاکہ میں کوئی اقدام کر سکوں۔

اہلِ مدینہ نے جب آپ کو مشورہ دیا کہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے مرکزِ خلافت سے بعض باصلاحیت افراد کو مختلف علاقوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے تو آپ نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور مختلف افراد کو مختلف علاقوں کی طرف روانہ کیا۔

ایک مصری عالم صادق ابراہیم عرجون لکھتے ہیں:۔

وَ قَدْ جَعَلَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَهُمْ سَادَةُ الْاُمَّةِ وَ اَعْلَامُهَا وَفِیْهِمْ اَعْضَاءُ مَجْلِسِ شُوْرٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ الْمُرَشَّحُوْنَ لِلْخِلَافَةِ مَجْلِسًا نِیَابِیًّا لَهٗ حَقُّ الرِّقَابَةِ عَلٰی اَعْمَالِ السُّلْطَةِ الْعُلْیَا فِی الدَّوْلَةِ وَقَدْ دَعَمَ هٰذِهِ الرِّقَابَةَ بِقَوْلِهٖ لَهُمْ اَنْتُمْ شُرَكَائِیْ وَشُهُوْدُ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاَشِیْرُوْا عَلَیَّ وَقَدْ اَخَذَ بِمَشُوْرَتِهِمْ وَعَمِلَ بِرَاْیِهِمْ [1]

حضرت عثمانؓ نے اہلِ مدینہ کی ایک مجلس بنائی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو امت کے سردار اور عمائدین ہیں اور ان ہی میں حضرت عمرؓ کی شوریٰ کے ارکان اور خلافت کے اہل اشخاص شامل تھے اور آپ نے اس مجلس کو سلطنت کے تمام اہم معاملات کی نگرانی کا حق عطا کیا تھا اور آپ نے اس اختیار کو اپنے اس قول سے نہایت قوی کر دیا کہ تم میرے شریک ہو حضرات اور مومنین کے نمائندہ ہو، لہٰذا مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو اور آپ نے ان کے مشورہ کو قبول کیا اور اس پر عمل کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور کے چند نمایاں واقعات کو ہم نے خالص تاریخی رنگ میں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے، ان تمام واقعات میں شورائیت پورے آب تاب کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ ان واقعات میں سے کسی واقعہ پر انگلی رکھ کر یہ نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ یہاں شورائیت مجروح ہوئی ہے، خلیفہ کے انتخاب سے لے کر دیگر تمام اساسی امور میں جمہوریت کے حسین رخسار پر آمریت کی ذرہ برابر پرچھائیں کہیں نظر نہیں آتی۔

یہ وہ دورِ مسعود ہے جسے ہر مسلمان اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دیتا ہے، اس کے لیے اسوہ صرف خدا کے برگزیدہ رسول کی بے داغ سیرت اور اس کے متبعین کے پاکیزہ کردار میں پنہاں ہے جب تک انفرادی اور اجتماعی زندگی ان خطوط پر استوار نہیں ہوگی اسے ہم اسلامی زندگی سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اسلامی ریاست میں امیر کی حیثیت

مذکورہ بالا واقعات کی تحقیق وتنقید کے بعد آیئے ان واقعات کی بھی نوعیت متعین کی جائے جن میں خلیفہ نے شوریٰ کی مخالفت کی ہے یا اکثریت کی رائے کو رد

[1] عثمان بن عفان ص ۹۹

کردیا اور کسی فرد واحد کے مشورہ پر عمل کیا ہے۔

ان واقعات کی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ اصول ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ اسلامی مملکت کا امیر نہ تو تاجِ برطانیہ کی طرح بے دست و پا حاکم ہوتا ہے اور نہ اسے مسولینی اور ہٹلر کی طرح آمرِ مطلق کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اسلام نے اپنے تمام معاملات کی طرح اس میں بھی افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک متوسط راہ اختیار کی ہے وہ نہ تو کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ملک و قوم کی جان و مال حوالہ کر دیتا ہے کہ جس وقت چاہے قوم کی ہستی کو تہس نہس کر کے رکھ دے اور اس پر گرفت کرنے والی کوئی بالادست طاقت نہ ہو اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ حاکم برائے نام تختِ سلطنت پر بت بنا بیٹھا رہے اور اقتدار کی کنجیاں کسی خاص فرد یا افراد کے ہاتھ میں ہوں۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ حکومت و اقتدار کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور قانون سازی اور حکمرانی کا حق دار بلا شرکتِ غیرے وہی ہے اور جو گروہ اللہ کے اس اقتدار کو تسلیم کرلیتا ہے اس گروہ کا ایک ایک فرد اللہ تعالیٰ کے اس حق کا امین اور پاسبان قرار پاتا ہے، اس امانت کی حفاظت اور نگرانی پوری امت پر عائد ہوتی ہے، اگر خدانخواستہ یہ امانت ضائع کردی گئی تو امت کا ہر فرد اصل مالک کے روبرو جواب دہ ہوگا۔ لیکن چونکہ اجتماعی نظم کے بغیر ملک و ملت مراحلِ ارتقا طے نہیں کرسکتے بلکہ ان کا وجود بھی ناممکن ہے اس لیے امت پر بحیثیت مجموعی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس امانت کو کسی ایسے شخص کے حوالے کرے جو امت کا صالح ترین فرد ہو، جس کی سیرت پر امت کو اعتماد ہو اور جس کے پختہ کردار نے اپنے آپ کو اس عظیم بار کے برداشت کرنے کا اہل ثابت کردیا ہو تاکہ یہ شخص امت کے اجتماعی کاموں کو اس احساس کے ساتھ سرانجام دے کہ ساری امت جس امانت کی حامل تھی وہ اس کے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے، خدا کے دین کی حفاظت و سربلندی، خدا کے بے شمار بندوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی غم خواری و دم سازی کی عظیم ذمہ داریاں امت نے اس کے حوالے کردی ہیں اور وہ ان کاروبارِ امت کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی کرے گا تو مرنے کے بعد اپنے مولیٰ کے حضور جواب دینا پڑے گا اور اس دنیا میں بھی امت کا بچہ بچہ اپنی امانت کے سلسلہ میں اس سے بازپرس

کرسکتا ہے اور پوچھ سکتا ہے کہ جن امور میں امت نے تمہیں اپنا معتمد علیہ قرار دیا تھا ان کی کہاں تک تم نے تکمیل کی اور اگر نہیں کی تو کیوں نہیں کی اس تصور سے دو قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ اسلامی ریاست کا صدر ایک ذمہ دار با اثر اور معتمد شخص ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہوگی کہ امت کو صلاح و فلاح کی راہ پر لے چلے اور ان تمام غلط راہوں پر گامزن ہونے سے باز رکھے جو ہلاکت دنیا ہی تک منتہی ہونے والے ہیں، بدکردار کو اس کی بدعملی کی سزا دے اور نکوکار کو اس کے حسن عمل کی جزا دے، قوم و ملک پر کوئی آنچ آئے تو اس کی حفاظت کا سامان کرے اور ملک کی ترقی و سربلندی کے اسباب فراہم کرے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قوت نافذہ خلیفہ کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کا کام اس کے بغیر انجام نہ پاسکے۔

اس تصور کا دوسرا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی مملکت کا صدر عوام کے روبرو جواب دہ ہوگا۔ اس وجہ سے وہ من مانی کارروائی نہیں کرسکتا اور نہ ہی کوئی ایسا اقدام کرسکتا ہے جو مملکت کے حق میں ضرر رساں اور تباہ کن ہو۔ اس لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا صدر داخلی اور خارجی پالیسی، جنگ و صلح اور ایسے ہی ان تمام بنیادی معاملات میں جن کا تعلق مملکت کے بقا و تحفظ سے ہو اور وہ معاملات جو اس کی موت و حیات پر اثر انداز ہوسکتے ہوں بغیر مشورہ کے انجام نہ پائیں اسی وجہ سے مذکورہ بالا مثالوں میں آپ دیکھیں گے کہ خلیفہ وقت نے امت کی مرضی کو ساتھ لے کر اقدام کیا ہے اور نہ وہ اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرنے کا مجاز ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں خلیفہ پارلیمنٹ کی رائے کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتا۔

ایسے اہم اور اساسی امور کے علاوہ دیگر تمام معاملات مثلاً کتاب و سنت کے کسی نص کی تشریح و توضیح یا کسی خاص مسئلہ میں اجتہاد و استنباط، کسی سزا کا تعین یا کسی جزئی مسئلہ میں مخصوص پہلو کا ترک و اختیار اور ایسے ہی دوسری چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں خلیفہ آزاد ہوگا اور اپنی ذمہ داری پر اقدام عمل کرے گا کیونکہ اس قسم کے مسائل اہم اور اساسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے، ہاں آسانی اور سہولت کے لیے خلیفہ اربابِ فقہ و بصیرت، حالات کے نباض، اور ایسے تمام لوگوں سے جنھیں واقعات کا صحیح فہم حاصل ہے

مشورہ کرے گا۔ ایسے تمام معاملات میں خلفائے راشدین کا یہی عمل رہا ہے۔ حدیث و تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ خلفاء ان جزئی معاملات میں بھی مشورہ ہی سے کام کرتے تھے۔

ان مشیروں کی حیثیت نمائندگانِ امت کی سی نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنی فہم و دانائی اور ژرف نگاہی کے باعث خلیفہ کے مشیر قرار پاتے تھے، جیسے کہ آج کل صدر امریکہ کے سیکریٹری ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان مشیروں میں بیشتر اصحاب اپنی فطری صلاحیتوں اور ان پر قوم کے اعتماد کی وجہ سے نمائندگانِ قوم کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ مجھے اکابر صحابہ کے برابر جگہ دیتے تھے اور اس کی وجہ حضرت ابن عباسؓ کی زیرکی اور فہم و بصیرت تھی جس سے بہت سارے سن رسیدہ لوگ بھی محروم تھے۔

امام بخاریؒ حضرت عمرؓ کے مشیروں کے متعلق لکھتے ہیں۔

وَكَانَ الْقُرَّاءُ أَصْحَابَ مَشُوْرَةِ عُمَرَ كُهُوْلًا كَانُوْا أَوْ شُبَّانًا ؎۲

قرآن کے عالم حضرت عمرؓ کے مشیر ہوتے تھے، خواہ وہ عمر ہوں یا نوجوان۔

امام زہریؒ کہتے ہیں :-

كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِذَا نَزَلَ الْأَمْرُ الْمُعْضِلُ دَعَا الْفِتْيَانَ فَاسْتَشَارَهُمْ يَبْتَغِي حِدَّةَ عُقُوْلِهِمْ ؎۳

حضرت عمرؓ کے سامنے جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو نوجوانوں کو بلا کر مشورہ کرتے تاکہ ان کی ذہانت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

بغویؒ نے امام زہریؒ کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی مجلس ہمیشہ علماء و فقہاء سے کھچا کھچ بھری رہتی تھی جن سے آپ مشورہ طلب امور میں مشورہ کرتے تھے ؎۴

ابن سیرینؒ نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ عورتوں سے بھی مشورہ کرتے تھے اور

؎۱ صحیح بخاری کتاب المغازی، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۲۰-۵۳۹ ۔ ؎۲ صحیح بخاری کتاب الاعتصام باب قول تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم الخ ؎۳ السنن الکبریٰ ج ۱۰ ص ۱۱۳، مختصر جامع بیان العلم وفضلہ ص ۲۴۲
؎۴ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۱۹

بسا اوقات آپ کو ان کی کسی رائے میں حسن و خوبی کا پہلو نظر آتا تو اسے اختیار فرماتے ؎۱

حضرت حسن بصریؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی جس طرح مردوں سے مشورہ فرماتے اسی طرح عورتوں سے بھی رائے لیتے اور ان کی رائے درستگی پر مبنی ہوتی تو اسی کو اپناتے ؎۲

امام ابن تیمیہؒ حضرت عمرؓ کے متعلق لکھتے ہیں :-

وَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يُشَاوِرُ الصَّحَابَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ فِي الْحَوَادِثِ يُشَاوِرُ عُثْمَانَ وَعَلِيًّا وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ عَوْفٍ وَابْنَ مَسْعُوْدٍ وَزَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ حَتّٰى كَانَ يُشَاوِرُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَكَانَ يَرْجِعُ تَارَةً إِلٰى رَأْيِ هٰذَا وَتَارَةً إِلٰى رَأْيِ هٰذَا ؎۳

حضرت عمرؓ مختلف معاملات میں صحابہ سے مشورہ کرتے تھے حضرت عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم، حتیٰ کہ ابن عباسؓ سے مشورہ کرتے کبھی ان کی اور کبھی ان کی رائے اختیار فرماتے۔

لکھتے ہیں حضرت عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ مسائل میں ایک دوسرے کی طرف مراجعت کرتے تھے اسی طرح حضرت علیؓ، ابی بن کعبؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ آپس میں رائے مشورہ کرتے تھے ؎۴

حضرت عثمانؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے روبرو کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو مقدمہ کے ایک فریق سے کہتے جاؤ علیؓ کو بلا لاؤ۔ دوسرے فریق کو طلحہؓ، زبیرؓ اور بعض دیگر صحابہ کو لے آنے کا حکم دیتے، ان حضرات کے جمع ہو جانے کے بعد فریقین کو مقدمہ پیش کرنے کا حکم دیتے، مقدمہ سنائے جانے کے بعد ان بزرگوں کی رائے دریافت فرماتے اگر ان حضرات کی رائے اپنی رائے کے موافق پاتے تو اسی وقت فیصلہ فرما دیتے ورنہ ان آراء کی روشنی میں غور کر کے فیصلہ کرتے ؎۵

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں دو مختلف قسم کے ایوان ہوتے تھے، ایک ایوان عام جس میں مہاجرین و انصار کے نمائندے جمع ہو کر فیصلہ کن معاملات اور اہم سیاسی امور پر غور کرتے۔ اس ایوان کے اجلاس ایسے ہی اوقات میں منعقد ہوتے جب کہ کسی اہم اور

؎۱ کنز العمال ج ۲ ص ۱۶۳ ۔ ؎۲ عیون الاخبار ج ۱ ص ۲۷ ؎۳ منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۵۱، ؎۴ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۲، ؎۵ السنن الکبریٰ ج ۱۰ ص ۱۱۳

بنیادی معاملہ کو زیرِ بحث لانا مقصود ہوتا، اس ایوان میں جب کسی رائے پر اجماع ہوجاتا تو امیر اس کے خلاف اقدام نہیں کرسکتا تھا۔ روزمرہ کے مسائل میں ایوانِ خاص منعقد ہوتا تھا جس کے مشوروں کی پابندی امام پر لازم نہیں ہوتی تھی چونکہ مسائل کے حل کرنے کا یہ ایک فطری طریقہ ہے اس لیے اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ اور آج بھی پابندی کی جانی چاہیے۔ کتبِ حدیث و تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ دورِ اول میں نہ صرف خلفائے راشدین بلکہ عام صحابہ کرام کے درمیان بھی اس کا رواج تھا۔

مسیب بن رافع کہتے ہیں کہ جس مسئلہ میں صحابہ کرام کو کتاب و سنت کی واضح تعلیم نہ ملتی تو آپس میں جمع ہو کر مشورہ کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچتے، جس امر پر ان کا اجماع ہوجائے وہی حق ہے[1]۔

قسم تابعی سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا، جواب دیا کہ نہ تو میں اس مسئلہ میں مشورہ کرنے پر مجبور ہوں اور نہ میرے ذہن میں اس کا کوئی جواب ہے[2]۔

اس قسم کے مشاورتِ باہمی کی ایک مثال صحابہ کے دور سے اس وقت پیش کی جاتی ہے۔

ابو مسلم خولانیؒ کہتے ہیں، ایک مرتبہ میں دمشق کی مسجد میں گیا، دیکھا کہ معمر صحابہ کا ایک حلقہ لگا ہوا ہے اور اسی حلقہ میں سرمگیں آنکھوں اور چمکدار دانتوں والا ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا ہے، اور اس مجلس میں مسائل زیرِ بحث آتے جا رہے ہیں، جب کسی مسئلہ میں ان بزرگوں کے مابین اختلاف ہوتا تو سب اس نوجوان کی طرف رجوع کرتے، اس نوجوان کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مشہور صحابی معاذ بن جبل ہیں[3]۔

خلفاء کے اس دوسرے ایوان کی بالکل یہی حیثیت ہوتی تھی، اب ہم اسی قسم کے چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ہر شخص بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایوانِ خاص میں حل کیے جانے والے مسائل اور ایوانِ عام میں زیرِ بحث آمدہ مسائل (جن کی مثالیں صفحاتِ بالا میں پیش کی جاچکی ہیں) میں نوعیت کا کتنا عظیم الشان فرق ہے۔

۱۔ سب سے پہلے چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جزئی معاملات میں بھی

[1] سنن دارمی ص ۳۵ باب التورع عن الجواب فیما لیس فیہ کتاب ولا سنۃ، الاعتصام للشاطبی ج ۳ ص ۱۳۷۔ امام شاطبی کے نقل کردہ الفاظ سنن دارمی کے الفاظ سے مختلف ہیں البتہ مفہوم ایک ہے۔ [2] سنن دارمی ص ۳۶، [3] مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۶

مشیروں کے مشوروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی اور جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو انھیں رد نہ کیا جاتا تھا۔

جمع قرآن حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن کے مختلف اجزا جو مختلف صحیفوں اور حفاظِ قرآن کے سینوں میں محفوظ ہیں انھیں تحریری شکل میں یکجا کر لیا جائے۔ ابتدا میں حضرت ابوبکرؓ نے کچھ پس و پیش کیا، لیکن بعد میں ان پر حضرت عمرؓ کے مشورہ کی عظمت واضح ہوگئی اور قرآن کو ایک نسخہ میں جمع کروا دیا[1]۔

حضرت عثمانؓ کے دور تک یکجا مرتب شکل میں قرآن مجید کا صرف ایک نسخہ تھا۔ حضرت حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ کو مشورہ دیا کہ اس کے متعدد نسخے نقل کروا کر متعدد ممالک میں بھیج دیئے جائیں تاکہ صحیح نسخوں کی کمی کے باعث قرآن غلط سلط پڑھنے سے لوگ محفوظ رہ سکیں، حضرت عثمانؓ نے اس مشورہ کو قبول کیا اور پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی کے حوالے یہ کام کیا کہ قرآن کے متعدد نسخے تیار کریں[2]۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اس سلسلہ میں حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ سے بھی مشورہ کیا تھا[3]۔

وطی کی سزا حضرت خالدؓ کے سامنے ایک شخص کو لواطت کے جرم میں گرفتار کر کے پیش کیا گیا، چونکہ کتاب و سنت میں اس جرم کی کوئی متعین سزا موجود نہیں ہے اس لیے حضرت خالدؓ نے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکرؓ کی طرف مراجعت کی، حضرت ابوبکرؓ نے مسئلہ کو اپنے مشیروں کے سامنے پیش کیا اور اپنی ذاتی رائے کی بھی تصریح کردی کہ وطی کو قتل کی سزا دی جانی چاہیے، مشیروں نے اس رائے کی ہمنوائی کی تھی کہ اتنے میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ خلافِ فطرت اور مکروہ فعل صرف قتل ہی کا مستحق نہیں ہے بلکہ اس کی سزا سخت ترین اور عبرتناک ہونی چاہیے تاکہ پھر کسی کو اقدام کی ہمت نہ ہو۔ عرب مثلہ کی سزا کو سب سے گھناؤنی سزا اور جبینِ انسانیت پر ایک بدنما داغ سمجھتے ہیں اس فعل شنیع پر کوئی ایسی سزا تجویز کی جائے جو مثلہ سے بھی زیادہ معیوب ہو اور میری رائے میں اس فعل شنیع کے مرتکب کو نذرِ آتش فروزاں کر دیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی کے مطابق حد جاری کرنے کا حضرت خالدؓ کو حکم دیا[4]۔

[1] صحیح بخاری جمع القرآن [2] صحیح بخاری باب جمع القرآن۔ [3] فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۶۳۔ [4] المحلی لابن حزم ج ۱۱ ص ۳۸۰

امیرالمومنین کا لقب گورنرِ عراق نے دو عراقیوں کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کو امیرالمومنین کے لقب سے یاد کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لقب کے سننے کے بعد حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ خلیفہ کا کوئی سرکاری لقب ہونا چاہیے جس سے وہ یاد کیا جائے ورنہ اگر پہلے خلیفہ کو خلیفۂ رسول کہا جائے اور دوسرے کو خلیفۂ خلیفۂ رسول تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم مومنین ہیں۔ اور آپ ہمارے امیر لہٰذا آپ کو امیرالمومنین کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔[1]

خلیفہ کی تنخواہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ اور دیگر اکابرِ قوم سے دریافت کیا کہ خلیفہ بیت المال سے تنخواہ لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر لے سکتا ہے تو کس قدر؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ آپ اپنے لیے اور اپنے ان تمام اہل و عیال کے لیے جن کی کفالت کا بار آپ پر ہے معروف طریقہ سے تنخواہ لے سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا یہ مال جو پوری قوم کی ملکیت ہے اسے کس طرح میں اپنے ذاتی اخراجات میں لا سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا چونکہ قوم ہی کے مفاد کے لیے آپ اپنے حصولِ رزق سے باز آ گئے ہیں بلکہ اجتماعی مصروفیات نے کسبِ رزق سے باز رکھا ہے اس لیے آپ کو اس مال سے معروف طریقہ پر مستفید ہونے کا حق ہے۔[2]

عارضی زکوٰۃ شام کے کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ بہت سارے گھوڑے، غلام اور مختلف قسم کے اموال ہمیں حاصل ہوئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان سے "زکوٰۃ" وصول کی جائے تاکہ ہمارا مال پاک ہو۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ زکوٰۃ ایک دینی فریضہ ہے اور اس کے وصول کرنے کے لیے چند خاص شرائط ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم کا کوئی شخص مجاز نہیں ہے۔ تم جس قسم کی "زکوٰۃ" دینا چاہتے ہو اس کا ثبوت آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے دور میں نہیں پایا جاتا لہٰذا مجھے اس کے قبول کرنے میں تامل ہے۔[3]

---

[1] ابن عبدالبر نے استیعاب میں دو قسم کی روایتیں نقل کی ہیں جن میں ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقیوں کے کہنے کے بعد یہ لقب اختیار کیا گیا اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشورے سے اسے اختیار کیا گیا ہم نے مذکورہ بالا طریقہ سے دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق دی ہے۔ ابن سعد کی روایت سے مجملاً اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امیرالمومنین کا لقب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے اختیار کیا گیا۔ [2] ابن سعد ج ۳ ص [illegible]۔ [3] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص [illegible]، اس سلسلہ میں بعض اور بیانات بھی ملتے ہیں۔

آپ نے اس سوال کو اپنی شوریٰ میں پیش کیا حضرت علیؓ نے جواب دیا اگر اس "زکوٰۃ" کی نوعیت مستقل ٹیکس کی نہیں ہے اور یہ لوگ برضا و رغبت زکوٰۃ کی تعداد کے لحاظ سے کچھ مال اللہ کی راہ میں دینا چاہتے ہیں تو اس میں تامل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ کے بعد آنے والے بھی اس پر عمل کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔[1]

بیرونی اموال پر ٹیکس منبج کا علاقہ دارالحرب میں شامل تھا وہاں کے باشندوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ہم آپ کے ملک میں تجارت کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو دس فیصد ٹیکس ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور ان کی پسندیدگی کے بعد اسے قانونی شکل دے دی۔[2]

غلاموں کی رہائی فتح عراق کے بعد وہاں کے قیدیوں کو حضرت عمرؓ اسلامی فوج کے درمیان تقسیم کر دینا چاہتے تھے۔ حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ انھیں غلام بنائے رکھنے کے بجائے آزاد کر دیا جائے اور ان سے جزیہ وصول کیا جاتا رہے اس سے مملکت کو مستقل فائدہ پہنچے گا۔ حضرت عمرؓ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اختیار کر لیا۔[3]

شراب کی حد قرآن و حدیث میں جرمِ مے خواری کے لیے کوئی متعین سزا نہیں بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کبھی چالیس کوڑے لگائے جاتے تھے اور کبھی یوں ہی زد و کوب کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔[4] حضرت عمرؓ نے چاہا کہ سرکاری طور پر اس کی ایک خاص حد مقرر کر دی جائے آپ نے اہلِ علم صحابہ کی مجلس میں یہ مسئلہ پیش کیا۔ اس مجلس کے شرکاء میں حضرت علی، طلحہ، زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ہمیں متعین طور پر ملتے ہیں۔[5] غالباً سب نے حضرت عمرؓ کی رائے کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد سزا کے تعین پر بحث ہوئی۔ حضرت علیؓ نے کہا آدمی جب نشۂ شراب سے بدمست ہو جاتا ہے تو اول فول بکنے لگتا ہے اور عموماً دوسروں کی آبرو ریزی بھی کر بیٹھتا ہے لہٰذا شارب کی سزا قاذف ہی کی سزا ہونی چاہیے جو قرآن کی رو سے اسی کوڑے ہے۔[6] حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ میری رائے میں بھی شرابی کی یہی حد ہونا چاہیے کیونکہ قرآن مجید نے سب سے کم تہمت کی سزا رکھی ہے لہٰذا شراب کی حد خدا کے متعین کردہ حدود میں سب سے ہلکی رہے (کیونکہ

---

[1] مسند احمد حدیث نمبر ۸۲۔ [2] کتاب الخراج ص ۱۶۱۔ [3] کتاب الخراج ص [illegible]۔ [4] ابو داؤد ج ۲ کتاب الحدود باب فی الحد فی الخمر۔ [5] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸۳۔ [6] موطا امام مالک کتاب الاشربہ باب الحد فی الخمر۔

اجتہاد میں حتی الوسع احتیاط برتنی چاہیے تاکہ کہیں کسی پر ظلم نہ ہونے پائے) چنانچہ اسی کے مطابق فیصلہ ہوا[1]

۲۔ اس قسم کے مسائل میں کبھی ایسا ہوتا تھا کہ امام کے سامنے مختلف رائیں آتیں اور وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتا۔

تشریع اذان ہجرت مدینہ کے بعد نماز با جماعت کا حکم نازل ہوا لیکن نماز کے اوقات کے اعلان کی کوئی صورت نہیں تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا، بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ آگ جلائی جائے تاکہ لوگ اس کی روشنی کو دیکھ کر جمع ہو سکیں، بعض دیگر اصحاب نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے لیکن پہلی صورت میں آتش پرستوں سے اور دوسری صورت میں اہل کتاب سے مشابہت پائی جاتی تھی اس لیے ان مشوروں کو پسند نہیں کیا گیا، دوسرے دن عبداللہ بن زیدؓ نے حضورؐ سے کہا کہ مجھے خواب میں نمازیوں کو وقت پر جمع کرانے کی ایک نئی صورت (اذان کی موجودہ شکل) بتائی گئی ہے، آنحضرتؐ نے عبداللہ بن زید کی دیکھی ہوئی شکل کو پسند فرمایا اور حکم دیا کہ حضرت بلالؓ کو سکھا دی جائے تاکہ وہ زور سے اذان دے سکیں حضرت عمرؓ نے بعد میں کہا کہ بعینہٖ یہی خواب انھوں نے بھی دیکھا[2]۔

تعریضاً قذف کی سزا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دو شخص کسی بات پر الجھ پڑے اور سب و شتم تک نوبت پہنچ گئی اسی اثناء میں ایک شخص نے دوسرے سے کہا میرا باپ زانی ہے نہ میری ماں، گویا قائل نے اس تعریض کے ذریعہ اپنے حریف کے ماں باپ کے زانی ہونے کی تہمت لگائی۔ حضرت عمرؓ کے روبرو یہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا بعض صحابہ نے کہا کہ قائل نے صرف اپنے ماں باپ کی تعریف کی اتنی سی بات سے کسی دوسرے کا زانی ہونا واضح طور پر ثابت نہیں ہوتا، جب تک جرم واضح طور پر ثابت نہ ہو سزا نہیں دی جا سکتی لیکن بعض دوسرے صحابہ نے کہا اس موقع و محل میں قائل کے مذکورہ بالا جملہ کا مقصود اپنے حریف کے والدین پر تہمت طرازی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس پر حد قذف جاری ہونی چاہیے، حضرت عمرؓ نے دوسری رائے کو پسند کیا اور قائل کو اسی کوڑے لگوائے[3]

[1] ابوداؤد، کتاب الحدود باب فی الحد فی الخمر۔ [2] مشکوٰۃ باب الاذان۔

[3] موطا امام مالک کتاب الحدود باب الحد فی القذف والنفی والتعریض۔

سن ہجری کا آغاز حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسا دن مقرر کیا جائے جس سے مسلمان اپنی تاریخ متعین کر سکیں، آپ نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا، مختلف بزرگوں نے مختلف مشورے دیے، حضرت علیؓ نے فرمایا جس دن آنحضورؐ دار الشرک کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لے آئے اور اسلام کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی، اسی دن سے تاریخ شروع کی جائے، حضرت عمرؓ نے اس مشورہ کو قبول فرمایا اور اسی دن کو اسلامی تاریخ کا پہلا دن مقرر کیا[1]

۳۔ اب ہم چند ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات خلیفہ نے اکثریت کی رائے کے مقابلہ میں کسی ایک فرد کی رائے کو زیادہ قوی پا کر ترجیح دی ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک حاملہ کو غالباً کسی جرم پر سزا دینے کے لیے طلب کیا، سزا کے خوف سے عورت کا حمل ساقط ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں صحابہ سے مشورہ کیا، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عثمانؓ نے کہا کہ آپ اس کی تادیب و اصلاح چاہتے تھے اور اس حادثہ میں آپ کے قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم آپ کو ہر قسم کی ذمہ داری سے بری سمجھتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی رائے اس کے خلاف تھی۔ فرمایا ممکن ہے آپ کو گناہ نہ ہو کیونکہ آپ کی نیت نیک تھی لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دیت ادا کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ کو پسند کیا اور اس پر عمل کیا[2]

ایک عورت حضرت عمرؓ کی عدالت میں حاضر ہوئی اور جرم زنا کا اقرار کیا، حضرت عمرؓ کے پاس جو صحابہ موجود تھے انھوں نے حد کے جاری کرنے کا مشورہ دیا، حضرت عثمانؓ اسی مجلس میں اپنی جگہ خاموش تھے، حضرت عمرؓ نے دریافت کیا، عثمان! آپ کیوں خاموش ہیں؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا اس عورت کے برملا اقرار سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ یہ حرمت زنا اور اس کی بھیانک سزا سے واقف نہیں ہے، عورت سے دریافت کرنے پر یہی صورت نکلی، حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے مشورے کے مطابق عورت کو معافی کا پروانہ عطا کیا[3]

۴۔ ذیل میں ہم دو چار ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جو جزئی مسائل میں امام کے اختیار کامل پر صاف دلالت کرتے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ نے شوریٰ کی رائے کے مقابلہ میں اپنی ہی رائے کو قابل عمل سمجھا،

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۴، تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۵۳ [2] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸۱۔ [3] منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۳۴

اور اس پر عمل کیا ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ کی بعض فروگذاشتوں پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی معزولی کا مشورہ دیا اور بار بار اپنی رائے کو دہراتے رہے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورہ کو نہیں مانا اور خالدؓ پورے دورِ صدیقی میں اپنے منصب پر قائم رہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن سعید بن العاص کو کمانڈر مقرر کرنا چاہا چونکہ بن سعیدؓ نے ایک موقعہ پر بعض نامناسب خیالات کا اظہار کر دیا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس سے باز رکھنے کی سعی کی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے باوجود انھیں کمانڈر مقرر کیا[1]

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ صحابہ سے مشورہ کیا کہ میت کے ترکہ کے زیادہ حقدار اس کے بھائی ہیں یا اس کا دادا جب کہ باپ نہ ہو حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے میں دادا باپ کے قائم مقام تھا اس لیے آپ نے بھائیوں کی نسبت اسے زیادہ حق دار قرار دیا، لیکن زید بن ثابتؓ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی رائے اس کے خلاف تھی، ان بزرگوں کے نزدیک میت کے ترکہ کے دادا کی بہ نسبت بھائی زیادہ حق دار تھے۔ (گو کہ حضرت علیؓ اور زید بن ثابت کی آراء آپس میں ذرا سی مختلف تھیں) زید بن ثابتؓ نے مختلف تمثیلوں کے ذریعہ اپنی رائے کی حقیقت واضح کرنے کی سعی کی اور کہا کہ ایک درخت کی کسی ٹہنی سے جب دو شاخیں نکلتی ہیں تو یہ شاخیں اس ٹہنی سے بہ نسبت اصل پیڑ کے زیادہ قریب ہوتی ہیں لیکن حضرت عمرؓ نے ان دلائل کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر آج مجھے فیصلہ کرنا پڑا تو دادا ہی کے حق میں فیصلہ کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو جب ابولؤلؤ نامی ایک غلام نے شہید کر ڈالا تو جوشِ غضب میں آپ کے فرزند عبیداللہ نے قاتل کے ساتھ بعض اور مشتبہ لوگوں کا بھی کام تمام کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے مسندآرائے خلافت ہونے کے بعد سب سے پہلے یہی مقدمہ پیش ہوا۔ چونکہ قاتل کے قتل کرنے کا حضرت عبیداللہ کو کوئی حق نہیں تھا اور ساتھ ہی انھوں نے غیر قاتلین کو بھی قتل کر دیا تھا اس وجہ سے بعض صحابہؓ نے قصاص میں عبیداللہ

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ صہ

کے قتل کا مشورہ دیا۔ بعض دیگر صحابہ نے کہا چونکہ عبیداللہ سے یہ حرکت شدتِ غم اور بے اختیاری کے عالم میں سرزد ہوئی ہے اس لیے انھیں معاف کر دیا جائے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان تینوں رایوں میں سے کسی کو بھی قبول نہیں کیا بلکہ اپنے مال سے مقتول کی دیت ادا کی[1]

اس قسم کے بعض اور واقعات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ واقعات حد درجہ جزئی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت فقہی مسائل کی سی ہے جن میں ایک سے زیادہ آراء کا پایا جانا معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر بخوشی قائم رہ سکتا ہے۔ اور دوسروں کے سامنے اپنی رائے کی صحت پر دلائل بھی پیش کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے دلائل سے مطمئن ہو جائے گا تو اس کی ہمنوائی کرے گا لیکن جو مطمئن نہ ہوا اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان فقہی مسائل میں جس طرح خلفاء اپنے مشیروں کی رائے کے پابند نہیں ہوتے تھے بالکل اسی طرح عوام بھی خلفاء کی رائے و مسلک کی اتباع پر مجبور نہیں تھے اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمیں اسلام کے ابتدائی عہد میں ملتی ہیں لیکن جیسا کہ ہم صراحت کر چکے ہیں کہ خلفائے راشدین کے دور خصوصیت سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور میں یہ جزئی مسائل بھی عام طور پر شوریٰ ہی کے ذریعہ طے پاتے تھے اور جو مسائل باہمی مشورہ کے ذریعہ طے کیے جاتے ہیں انفرادی آراء کے مقابلہ میں اس کی حیثیت بہت ہی ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ قرآن و سنت میں دلیل نہ پانے پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور سے دلیل اخذ کرتے تھے۔ (بیہقی)

اسلام کے قانونِ شوریٰ کی یہ تفصیلی کیفیت ہے جو کتاب و سنت کے اوراق میں ہمیں ملتی ہے اور عاملینِ کتاب و سنت کی زندگیاں جس کی تصدیق کرتی ہیں۔ (ختم شد)

عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

اسلام کے ازدواجی مسائل پر مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکۃ الآرا تصنیف ۲۲/۱۸×۸ ۱۶۸ صفحات
قیمت ۲ روپے ۲۵ پیسے۔ ملنے کا پتہ:— مکتبہ میثاق رحمان پورہ - اچھرہ لاہور

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ صہ ۱۴۸-۱۴۹

اقتباسات وتراجم

از خالد مسعود صاحب ایم ۔ اے ۔ سی

تبلیغِ مسیحیت کے ہتھکنڈے[1]

عیسائی مشنریوں کے عزائم اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں عام طور پر لاعلمی بھی پائی جاتی ہے اور غلط فہمی بھی۔ بعض لوگ ان کے بظاہر خیر خواہانہ رویے کو دیکھتے ہوئے ان سے حسنِ ظن رکھتے ہیں اور اگر کوئی شخص ان کی توقع کے خلاف کوئی بات کہہ دے تو اس کو تعصب پر محمول کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی اور لاعلمی کی وجہ فی الحقیقت خود مشنریوں کی یہ پالیسی ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے عزائم کو بے نقاب نہیں کرتے اور خاموشی اور رازداری سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں لیکن اگر ان کی سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی اغراض کا پتہ چلانا دشوار نہیں۔

مشنری تحریکوں کے مقاصد عیسائی مشنری بظاہر کتنے ہی خاموش، عزلت پسند اور ہمدردِ انسانیت نظر آئیں لیکن ان کا مقصدِ وحید عیسائیت کی اشاعت ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کی جہالت، غربت، ضرورت ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی معاشی بحران، معاشرتی ہیجان اور سیاسی خلفشار کو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔ ہمارے ملک کے جاہل اور پست حال طبقہ میں ان کی سرگرمیاں معلوم ہیں اور انڈونیشیا اور افریقہ کے سیاسی حالات سے انھوں نے

[1] اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل مقالات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱- THE PROGRESS OF CHRISTIANITY IN PAKISTAN از سید محمد جمیل وائس آف اسلام کراچی

۲- التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ از استاذ طاہر لماس لیبیا - البعث الاسلامی لکھنؤ

۳- واقع الاسلام فی افریقیا از استاذ صالح مہدی سامرائی - البعث الاسلامی لکھنؤ -

جو فائدہ اٹھایا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اگر تبلیغی کوششوں سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور لوگ نصرانیت اختیار کرنے پر مائل نہیں ہوتے تو ثانوی حیثیت میں مشنریوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسیحیت کے حق میں کم از کم فضا ہموار کر دیں۔ اس کے لیے یہ عموماً قوم کے زیرک افراد پر کام کرتے ہیں اور ان کو ہر ممکن طریقہ سے مغربی تمدن اور فکر و فلسفہ کو قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ زیرک افراد کا انتخاب اس لیے ہوتا ہے کہ ان کی وساطت سے یہی آراء عام معاشرے میں پھیل جائیں۔

لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ مشنریوں کی تمام جد و جہد کی غایت نصرانیت کی اشاعت اور اس کے حق میں فضا پیدا کرنے تک محدود ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ ان کا اصل مطمحِ نظر کسی ملک کو استعماری طاقتوں کی آماجگاہ بنانا ہوتا ہے۔ ہماری یہ بات چونکہ بعض لوگوں کے لیے اچنبھے کا باعث ہوگی اس لیے اس کی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مشنریوں کی غایت ۔ استعمار استعماری طاقتوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ کسی قوم کا اتحاد ہے اس لیے مشنری معاشرے کے مختلف طبقات میں درپردہ اختلافات کے بیج بوتے ہیں اور پھر انھیں ابھارتے ہیں۔ عربوں میں کام کرنے والے ایک مشنری لارنس براؤن کا قول ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے :-

"عرب ممالک کے مسلمان اگر متحد رہتے ہیں تو یہ تمام دنیا کے لیے لعنت اور خطرہ بنے رہیں گے ... البتہ اگر ان میں پھوٹ پڑی رہے تو پھر یہ آسانی سے بہکائے جا سکتے ہیں۔ تب نہ ان کا کوئی وزن ہوگا، نہ اثر"

پادری سیمون کہتا ہے :-

"وحدتِ اسلامی ہی تمام قبائل کی امیدیں ہیں۔ یہی چیز انھیں یورپ کے تسلط سے بچائے ہوئے ہے اسی لیے مشنری تحریک اس رجحان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔"

۱۸۵۷ء میں اہلِ ہند کی جنگِ آزادی کے فوراً بعد جب انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اہلِ ہند ان کی سیادت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو انھوں نے مشنری کوششیں تیز سے تیز تر کر دیں اور اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم نے واشگاف الفاظ میں کہا :-

"اپنے امکان کی حد تک ہندوستان کے ایک ایک گوشے میں عیسائیت کے نفوذ کو بڑھانا ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ عین ہمارے مفاد کے مطابق ہے۔"

وزیر اعظم برطانیہ کا مدعا ان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ کے بیان سے بخوبی واضح ہوتا ہے، جو یہ ہے:-

"ہر نیا عیسائی ہمارے ملک کے ساتھ اتصال کا ایک اضافی بندھن اور سلطنت کے استحکام کا ایک اضافی ذریعہ ہے"

اور حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کے ساتھ یہ بندھن پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حال ہی میں افریقہ کی سیاسی صورت حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مشنریوں نے جو کوششیں کی ہیں، ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ گھانا کی حزب اقتدار کے سرکاری ترجمان نے کیتھولک چرچ پر استعماری طاقتوں کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا اور کانگو کے سابق وزیر اعظم مسٹر لومبا نے کیتھولک مشنری سوسائٹیوں کو بہت برا بھلا کہا۔ انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ ایک عیسائی مبلغ کا تنگا کو کانگو سے علیحدہ کرنے والی بلجیم کی فوج کے ایک اعلیٰ عہدہ پر پایا گیا۔

اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مغربی استعمار نے ہمیشہ تبلیغ کو اپنا اولین سہارا بنایا ہے۔ جونہی "اتصال کے لیے اضافی بندھن" انھیں کافی تعداد میں مل گئے ہیں، انھوں نے بڑھ کر ملک کے ملک کو غلام بنا لیا ہے۔ جس طرح سانپ کو گھر میں پال کر اس سے کسی خیر کی توقع رکھنا محض حماقت ہے، اسی طرح مشنریوں سے حسن ظن رکھ کر ان پر اعتماد کرنا بہت بڑی نادانی ہے۔

مشنریوں کا طریق کار عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مشنری اپنے مقصد کے لیے ایسا طریق کار اختیار کرتے ہیں جس پر بادی النظر میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ غربت و فلاکت اور بیماری و جہالت میں مبتلا انسانیت کے لیے فرشتہ رحمت ہیں۔ قوم و ملک کی بہتری اور خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں۔ چنانچہ یہ بچوں اور بچیوں کے لیے اسکول بنائیں گے اعلیٰ تعلیم کے مواقع پیدا کرنے کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں تعمیر کریں گے، علاج کی سہولتیں مہیا کرنے

کے لیے اسپتال کھولیں گے۔ لائبریریوں کے لیے مفت کتب تحفہ میں دیں گے اور غریبوں کی آبادیوں میں جا جا کر خشک دودھ اور کپڑے تقسیم کریں گے۔ لیکن یہ سارے کام کرتے ہوئے یہ اپنے مقصد سے کبھی صرف نظر نہیں کرتے۔

تعلیم کے میدان میں مشنریوں کی سرگرمی صرف اس وجہ سے ہے کہ افکار و نظریات پھیلانے اور اپنے مقصد کے لیے رائے ہموار کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک مشنری ہنری جیسپ کا قول ہے کہ

"مشنری مدارس میں تعلیم فقط ایک مقصد سے دی جاتی ہے اور وہ ہے لوگوں کو مسیح کی طرف رہنمائی"

مبلغ ملی کہتا ہے :-

"ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مدرسے قائم کریں اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام کریں کیونکہ جب مسلمان انگریزی زبان پڑھ لیتے ہیں تو ان کے اعتقادات متزلزل ہو جاتے ہیں۔ مغرب کی درسی کتابیں پڑھ لینے کے بعد مشرق کی مقدس کتاب پر اعتقاد انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔"

اسی پالیسی کا مظہر جا بجا پھیلے ہوئے مشنری کنڈر گارٹن، مشن سکول اور کالج ہیں۔ پاکستان میں انھوں نے کئی ڈگری کالج قائم کیے ہیں۔ دوسرے مسلمان ممالک میں قابل ذکر نیو کالج طرابلس غرب۔ رابرٹ یونیورسٹی استنبول، امریکن یونیورسٹی قاہرہ اور امریکن یونیورسٹی بیروت ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصیت سے مشنریوں نے توجہ دی ہے۔ قاہرہ کے گرلز کالج کی کارروائی پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے ایک عیسائی مبلغہ انا میلیگان نے کہا :-

"اسلام کے قلعہ میں گھسنے کے لیے اس مدرسہ کی راہ سے زیادہ مختصر راہ کوئی نہیں۔"

اسکولوں میں طلبہ کو جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی خصوصیت اس کے سوا کوئی نہیں ہوتی کہ ان میں مسلمانوں کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام پر حملے کیے جاتے ہیں۔

طلبہ سے ہٹ کر نوجوانوں میں تبلیغ کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کے لیے ہوسٹل قائم کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً مجالس و تقاریر کا اہتمام کرتے ہیں۔ ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن (Y.M.C.A) اور ینگ ویمنز کرسچین ایسوسی ایشن (Y.W.C.A) کی سرگرمیوں کا ہدف نوجوان طبقے

میں مسیحیت کا پرچار ہے۔

مشنری شفاخانوں کے منتظمین کو خاص ہدایات ہوتی ہیں کہ وہ مریضوں کا علاج کرتے وقت تبلیغ کا مقصد پیش نظر رکھیں اور مریضوں کو پڑھنے کے لیے مشنری لٹریچر دیا کریں۔

پاکستان میں عیسائیت کا ماضی وحال برصغیر ہندو پاکستان میں عیسائیت کی تاریخ دو سو سال پرانی ہے۔ انگریزوں کے سیاسی تفوق حاصل کرنے کے بعد اگرچہ مشنریوں کے کام میں نسبتاً آسانی پیدا ہوگئی تھی تاہم ان کی رفتار ترقی بہت کم رہی اور جن لوگوں نے عیسائیت قبول کی وہ زیادہ تر اچھوت اقوام سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۸۱ء تک ہندوستان میں پچاس ہزار عیسائی تھے اور شمالی ہند میں ان کا تناسب ایک فی تین ہزار تھا لیکن ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اسلام کو ترک کرکے عیسائیت میں آیا ہو۔ متحدہ پنجاب میں ۱۸۸۱ء میں کل تین ہزار تین سو اکیاون عیسائی تھے۔ حکومت کی کوششوں سے ۱۹۰۱ء میں ان کی تعداد چھتیس ہزار آٹھ سو چھپن ہوگئی۔ اس وقت حکومت نے خاص قدم یہ اٹھایا کہ نہری علاقے میں عیسائیوں میں زمینیں الاٹ کرنی شروع کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت کی رفتار ترقی بہت تیز ہوگئی اور بیس سال کے عرصے میں تعداد میں دس گنا اضافہ ہوگیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آج تک بھی ان علاقوں میں جہاں نہریں نہیں ہیں، عیسائی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اگر مختلف علاقوں کے شماریات دیکھے جائیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۲۱ء میں پاکستان کے علاقوں میں رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد تقریباً اسی ہزار رہی ہوگی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۹۲۱ء کی تعداد پر تیس فیصد کا مزید اضافہ ہوا۔ کینیڈا سے شائع ہونے والے مشنری جریدہ پراسپکٹر نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اطلاع دی کہ:—

• "پاکستان میں چرچ کو مسلمانوں کے عیسائی بنانے میں عظیم ترین کامیابی ہوئی ہے۔ گذشتہ سال وہاں آٹھ ہزار افراد کو بپتسمہ دیا گیا۔ اب وہاں سات کروڑ اسی لاکھ کی آبادی میں رومن کیتھولک عیسائی اسی ہزار سے بڑھ کر دو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو تر لیسٹھ کی تعداد کو پہنچ چکے ہیں۔" •

گویا پاکستان بننے کے بعد یہاں کے باشندوں اور خصوصاً مسلمانوں میں تبدیلی مذہب کا رجحان اتنا

زیادہ ہوگیا ہے کہ مشنری تحریک اپنی رفتار کار پر نازاں ہے اور یہ اعلان کرتی ہے کہ اتنی عظیم الشان کامیابی اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

پاکستان بنتے ہی یہاں کے مشنریوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب مسیحی تبلیغ کے امکانات ہمیشہ کی نسبت زیادہ روشن ہوگئے ہیں چنانچہ انھوں نے امریکہ، برطانیہ، کینیڈا وغیرہ ممالک سے امداد حاصل کرکے کام کی رفتار تیز تر کردی۔ ہارٹ فورڈ (امریکہ) سے شائع ہونے والے مسیحی جریدہ مسلم ورلڈ میں جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں پاکستان کی صورت حالات ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے:—

"ایک حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمان قوم کا سکون قلب اتنا متزلزل ہوا ہے کہ پہلے کبھی اتنا متزلزل نہیں ہوا۔ اب مسلمان مسیحیت دوستی پر زیادہ آمادہ نظر آتے ہیں …… مسیحی تعاون، ہمدردی اور رہنمائی کا اس سے عمدہ موقع پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا …… حکومت پاکستان عالمی چرچ کی خدمات کے سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کر رہی ہے۔"

اس وقت پاکستان میں چالیس مشنری سوسائٹیاں قائم ہیں جو امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، ہوئیڈن اور یورپ کے دوسرے ممالک کی طرف سے یہاں کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے گذشتہ دس سالوں میں تقریباً پچیس کروڑ روپیہ اپنے تبلیغی مشن پر خرچ کیا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مغربی طاقتوں کو پاکستان سے کسی نفع کی امید نہیں تو آخر وہ کیوں اس پر اتنی دولت صرف کر رہے ہیں؟

مسیحی عزائم حکومت کی تعاون کی پالیسی کے نتیجے میں پاکستان میں عیسائیوں کو اپنے مشن کی کامیابی کے آثار نمایاں نظر آرہے ہیں۔ مغربی پاکستان میں ان کے گاؤں کے گاؤں وجود میں آچکے ہیں۔ لائل پور میں جدید یروشلم، قائم ہوا ہے۔ ایک عیسائی لیڈر انتھونی ڈی سوزا صاحب عیسائیت کے مستقبل کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں وہ ملاحظہ ہو:—

"عیسائی اقلیت صرف بڑے شہروں یا قصبوں ہی میں مصروف کار نہیں۔ مسیحی استاد، ڈاکٹر، نرسیں اور قانون دان ملک بھر کے دیہات حتیٰ کہ جھونپڑوں تک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا خرچ مسیحی فرقوں کے فنڈز سے ادا ہوتا ہے اور یہ کسی طرح بھی ملک کے بجٹ پر بوجھ نہیں

بنتے ..... آج ہم پاکستان میں ایک عظیم قوم ہیں ..... اقلیت بے ضرر اسی وقت ہوتی ہے، جب وہ آزاد ہو اور اس کے لیے رکاوٹیں نہ ہوں۔ جب اسے یہ یقین دلایا جا سکے کہ وہ ملک کے لیے مفید ہے یا مفید ہو سکتی ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان میں اقلیت کا تعلق اسی نہج پر قائم ہو رہا ہے۔ پاکستان میں مسیحیت کا مستقبل روشن ہے ..... دوہری میراث پانے والے عیسائی ملک کے گھرانے میں آہستہ آہستہ اپنا حقیقی اور مضبوط مقام حاصل کر رہے ہیں۔ جتنا حصہ یہ اب ادا کر رہے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ ان کی آئندہ نسل ادا کرے گی"

اس بیان سے یہ بات عیاں ہے کہ عیسائی پاکستان کو فی الواقع خوانِ یغما سمجھ رہے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں اپنی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اکثریت کو بھی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ مسلم اکثریت کو، جو اس ملک کی قانوناً مالک ہے۔ یہ سوچنا چاہیے کہ مشنریوں کو آخر اتنی سہولتیں کس بنا پر حاصل ہیں اور کیا ایک اقلیت بیرونِ ملک سے ہمدردیاں رکھنے اور وہاں سے رقم وصول کرنے کا حق رکھتی ہے؟ ہمارا ملک استعماری طاقتوں کے ایجنٹوں کی آماجگاہ بنتا چلا جا رہا ہے اور انھیں یہاں اتنی کامیابی حاصل ہے کہ اتنی زبردست کامیابی اس سے پہلے انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ اس تشویش ناک صورت حال کا مقابلہ کرنے اور اپنے مذہب اور ملک کو بچانے کی ہمیں بلا تاخیر فکر کرنی چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہماری حکومت ایک طرف مشنری سوسائٹیوں کی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کرے، کسی اقلیت کو بیرونِ ملک سے تعلقات استوار کرنے اور ان سے مالی امداد قبول کرنے کی اجازت نہ دے، دوسرے ملک خود قوم غریبوں کی امداد کے لیے دینا چاہیں، انھیں حکومت اپنے کارندوں کے ذریعے تقسیم کروائے اور دوسری طرف ارتداد کے لیے سزا مقرر کرے تاکہ کسی کو ان مارِ آستین بنے ہوئے مشنریوں کا نوالہ بننے کی ہمت نہ ہو۔

خط وکتابت کرتے وقت پتہ صاف اور مکمل
تحریر فرمائیے (مینیجر میثاق لاہور)

تقریظ و تنقید

• سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

مرتبین :- اقبال احمد انصاری، محمد مسلم

ملنے کا پتہ :- دفتر سہ روزہ دعوت، کشن گنج، دہلی

سہ روزہ 'دعوت' جماعت اسلامی ہند کا ترجمان اخبار ہے اور کئی سال سے اچھے معیارِ صحافت پر شائع ہو رہا ہے۔ ہندوستانی اخباروں میں یہ پرچہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اخبارات کے عام وظائف کے علاوہ مسلمانوں میں دینی اقدار کے احیاء کی سرگرم کوشش کا فرض بھی انجام دے رہا ہے۔ 'سرورِ عالم' دعوت ہی کی ایک خصوصی پیشکش ہے جس میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے مختلف پہلو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ آج تک کسی نے اس کا حق ادا کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس مجموعہ کے مرتبین کو بھی اپنی کم مائگی کا احساس ہے۔ لکھتے ہیں :-

"تاریخ عالم کے انہی محسنوں کی آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگلے چند صفحات میں آپ ہی کے مبارک ذکر کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ ایسی ہزاروں لاکھوں کوششیں پہلے بھی کی جا چکی ہیں اور آئندہ بھی کی جاتی رہیں گی۔ اس لیے اس بے کراں سمندر میں چند قطروں کا اضافہ کوئی خاص وزن نہیں رکھتا البتہ قطروں کے لیے ضرور اس بات میں سعادت ہے کہ انھیں سمندر میں ملنے کا موقع مل رہا ہے۔"

مرتبین کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور یہ ان کے لیے زادِ راہ ثابت ہو۔

اس مجموعہ میں بیس مقالات اور چند نعتیں شامل ہیں۔ مقالات میں وہ نبی اور اس کا انتظار' ایک عظیم داعی حق و صداقت، رحمتِ دو عالم، رسول اللہ کی معاہداتی سیاست، جذبہ عبودیت اور ذات

رسول، سیرت طیبہ کے امتیازی پہلو، اور نبوت محمدی عقل کی کسوٹی پر، بہت وقیع ہیں۔ پرانے صحیفوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشین گوئیاں اور آنحضورؐ کے معاہدات یکجا کر کے شائع کرنا خاص طور پر لائق تحسین ہے۔ اس مجموعہ میں چند مضامین ماخوذ ہیں اور عبدالباری، شمس الآفاق اور ابو محمد امام الدین رام نگری کے مقالات کا مواد حیرت انگیز طور پر آپس میں ملتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر فاضل مرتبین ان میں سے صرف ایک مقالہ شامل کرنے پر اکتفا کرتے۔ اگرچہ دعوت کی یہ پیشکش بہت ایمان پرور مقالات کا مجموعہ ہے تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ فاضل مرتبین اگر مزید محنت کرتے تو اس پیشکش کی قدر و قیمت کو بہت کچھ بڑھا سکتے تھے۔

یہ مجموعہ غیر مجلد ہے اور میثاق کے سائز کے ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی قیمت ہندوستان میں دو روپے اور پاکستان میں دو روپے پچاس پیسے ہے۔ (خ۔م)

نصیحۃ المسلمین

تالیف : مولانا خرم علی بلہوری رحمہ اللہ (متوفی سنہ ۱۲۷۳ھ)
شائع کردہ : جمعیت اہل حدیث حلقہ مصری شاہ لاہور

اس رسالہ کے مصنف مولانا بلہوری سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی اٹھائی ہوئی دعوت اصلاح کے اہم ارکان میں سے تھے۔ انھوں نے یہ رسالہ مسلمانوں کے اندر بڑھتی ہوئی بدعات کے رد میں لکھا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"بعد سب کے سمجھنا چاہیے کہ اب ہندوستان میں عجیب ایک بلا پھیل گئی ہے کہ امت محمدی میں بہت لوگ شرک میں گرفتار ہیں لیکن اکثر مسلمان بیچارے بسبب بے علمی اور ناواقفی کے لاچار ہیں۔ تو اس واسطے بندہ عاجز خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجیے... جو مسلمان بھائی کہ عربی نہیں جانتے اس کو سمجھ کر شرک کی آفت سے بچیں اور اپنے پیغمبر کی راہ کو اختیار کریں۔"

مصنف نے اپنا یہ مقصد حسن و خوبی سے سادہ اور عام فہم اسلوب میں ادا کر دیا ہے۔ (باقی صـ ۶ پر)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق ۱۱ احمد سٹریٹ۔ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔